جاپان چلو
جاپان چلو
مجتبیٰ حسین

جاپان چلو، جاپان چلو

سفرنامہ

مجتبیٰ حسین

ناشر

حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان، حیدرآباد ۲

جاپان چلو ، جاپان چلو

(سفرنامہ)

مجتبیٰ حسین

فہرست

جاپان چلو۔۔ جاپان چلو

جولائی ۱۹۸۰ء کے مہینہ کی بات ہے ۔ ایک دن ہم حسب معمول دیر سے دفتر پہنچے تو پتہ چلا کہ خلاف معمول ہمارے افسر بالا نے ہمیں یاد کیا ہے ۔ ہم ہانپتے کانپتے ان کی خدمت میں پہنچے تو فرمایا " ہم تمہیں جاپان بھیجنا چاہتے ہیں ۔ کیا تم جانے کیلئے تیار ہو "

ہم نے کہا " سر! ہم جانتے ہیں کہ زمانہ قدیم میں جب کسی شخص سے کوئی جرم سرزد ہو جاتا تھا تو اسے سزا کے طور پر ملک بدر کر دیا جاتا تھا ۔ مانا کہ ہم دفتر دیر سے آتے ہیں لیکن یہ اتنا بڑا جرم تو نہیں کہ آپ ہمیں جاپان بھیج دیں ۔ پھر جاپان سے ہم بیسیوں چیزیں درآمد کرتے ہیں ۔ کیا اس ملک سے جاپان کو برآمد کرنے کیلئے ہم ہی ایک مناسب چیز رہ گئے ہیں ؟ ۔

بولے " تم ہر بات میں سے مزاح کا پہلو نکال لیتے ہو ۔ ہم تمہیں سچ مچ جاپان بھیجنا چاہتے ہیں ۔ جاپان کے بارے میں کچھ جانتے بھی ہو؟ ۔

ہم نے کہا " سر! ہائی اسکول تک جغرافیہ پڑھی تھی ۔ اس وقت تک تو جاپان براعظم ایشیاء میں ہی تھا ۔ اب بھی شاید ایشیا میں ہی ہو گا ۔ ہم ٹھیک سے کہہ نہیں سکتے کیونکہ سنا ہے کہ جاپان نے بہت ترقی کر لی ہے اور ترقی یافتہ ملکوں کا کوئی بھروسہ نہیں کہ کب کدھر کو نکل جائیں ۔ یوں بھی براعظم ایشیا ہم

جیسے ملنگوں کی سرزمین ہے، جہاں پیٹ کی اہمیت کم اور روح کی زیادہ ہے۔ ہمیں تو غریبی میں نام پیدا کرنے کی عادت سی ہوگئی ہے۔ ایسے برا عظم میں جاپان کا کیا کام؟ اگر ہم سے جاپان کے بارے میں مزید کچھ پوچھیں تو اتنا کہہ سکتے ہیں کہ جب ہم بہت چھوٹے تھے اور دوسری جنگ عظیم اپنے عروج پر تھی تو یوں لگتا تھا جیسے جاپان ہمارے گھر کے پچھواڑے میں واقع ہے۔ ہمیں ہر دم یہ بتایا جاتا تھا کہ جاپانی اب آنے ہی والے ہیں۔ جنگ ختم ہوگئی اور جاپان پھر اپنی جغرافیائی حدود میں واپس چلا گیا۔ جاپان کے بارے میں ہماری جھولی میں بس اتنی ہی معلومات ہیں"۔

بولے "جاپان کے بارے میں اور کیا جانتے ہو؟"۔

ہم نے دماغ پر قدرے زور دے کر کہا" ہاں! خوب یاد آیا۔ جاپان کی گڑیاں بہت مشہور ہیں"۔

بولے " بس اتنا کافی ہے۔ جاپان کے بارے میں تم تو بہت کچھ جانتے ہو۔ ہم جاپان کے دورے کیلئے تمہارا نام مرکزی وزارت تعلیم کو بھیج رہے ہیں"۔

ہم نے کہا" سر! آخر ماجرا کیا ہے۔ صاف صاف بتلائیے کہ آپ چاہتے کیا ہیں؟"

بولے "ٹوکیو میں یونیسکو کے ایشیائی ثقافتی مرکز کی طرف سے پبلشنگ کا ایک تربیتی کورس اکتوبر میں منعقد ہورہا ہے اس کیلئے ہندوستان سے ایک عہدہ دار کو روانہ کرنا ہے اور مرکزی وزارت تعلیم نے مختلف محکموں سے عہدہ

داروں کے نام مانگے ہیں۔ ہم اپنے ادارے سے تمہارا نام بھیج رہے ہیں۔ کیا پتہ کہ مرکزی وزارت تعلیم اس کورس کے لئے تمہارا انتخاب کرلے۔ کبھی کبھی انتخاب میں غلطی بھی تو ہوجاتی ہے"۔

ہم نے اس ذرہ نوازی کا شکریہ ادا کیا اور اٹھ کر جانے لگے تو ہمارے افسر بالا نے پوچھا" اس سے پہلے کبھی ہندوستان سے باہر گئے ہو؟"

ہم نے کہا" سر! جی تو ہمارا بھی بہت چاہتا ہے کہ نئی نئی زمینیں دیکھیں، نئے نئے آسمانوں میں جھانک آئیں، گھاٹ گھاٹ کا پانی پئیں، نئے لوگوں سے نئی نئی باتیں کریں، نئے چہروں کو نئے ڈھنگ سے دیکھیں، مگر ہمارا جذبہ حب الوطنی ہمیں باہر جانے نہیں دیتا۔ ہمیں ہر دم یہ فکر رہتی ہے کہ اگر ہم باہر چلے گئے تو پھر ملک کا کیا ہوگا۔ ہمارے بغیر آخر ملک کس طرح ترقی کرسکتا ہے۔ پھر ہم نے کچھ ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو دس دن کیلئے ہی سہی باہر کے کسی ملک میں جاکر آتے ہیں تو زندگی بھر اس ملک کے قصے اور وہ بھی من گھڑت قصے سنا کر اپنا اور اہل وطن کا وقت برباد کرتے ہیں۔ انہیں اپنے ملک کا سورج اچھا نہیں لگتا۔ چاند کی طرف دیکھتے ہیں تو منہ موڑ کے کہتے ہیں " برطانیہ میں جو چاند ہم نے دیکھا تھا وہ چاند بھلا اس ملک میں کہاں نظر آئے گا۔ بھلا یہ بھی کوئی چاند ہے" غرض انہیں اپنے ملک کی کوئی چیز اچھی نہیں لگتی۔ خدانخواستہ جاپان کے دورے کیلئے ہمارا انتخاب ہوگیا تو اس ملک میں

بقیہ زندگی کس طرح گزاریں گے ۔ ہمارے افسر بالا نے کہا " ہم تمہارے جذبہ حب الوطنی کا امتحان لینا چاہتے ہیں ۔ تبھی تو تمہارا نام اس دورے کیلئے تجویز کر رہے ہیں ۔ رہی یہ بات کہ تم باہر چلے گئے تو اس ملک کا کیا ہوگا ۔ اس سلسلے میں ہمارا خیال ہے کہ موجودہ حالات میں تمہارا باہر جانا بہت ضروری ہے تاکہ ہمیشہ کیلئے تمہاری خوش فہمی دور ہوسکے " ۔

اس بات چیت کے بعد ایک مہینہ بڑی خاموشی کے ساتھ گزر گیا ۔ ایک دن دفتر میں بیٹھے کام کر رہے تھے کہ ایک دوست نے آکر چپکے سے کہا " اگر تم جاپان سے میرے لئے ایک بڑھیا ٹرانزسٹر لاسکو تو تمہیں ایک خوشخبری سنانی ہے " ۔

ہم نے کہا " ضرور سناو " ۔

بولے " پہلے ٹرانزسٹر لانے کا وعدہ کرو پھر سناتا ہوں " ۔ ہم نے وعدہ کرلیا تو موصوف نے پہلے تو وہ کاغذ ہاتھ میں تھما دیا جس میں ٹرانزسٹر کی تفصیلات لکھی ہوئی تھیں ۔ پھر فرمایا " یار! ابھی ابھی مرکزی وزارت تعلیم سے اطلاع آئی ہے کہ جاپان کے دورے کیلئے تمہارا انتخاب ہوگیا ہے ۔ اب تو تمہیں میرے لئے ٹرانزسٹر لانا ہی ہوگا ۔ یونیسکو کے مہمان ہو کوئی مذاق نہیں ہے ۔ ۳۵ دنوں تک روزانہ دس ہزار ین (جاپانی سکہ) تمہیں ملا کریں گے ۔ میرا ٹرانزسٹر تو صرف تین چار ہزار ین میں آجائے گا " ۔ یہ پہلی فرمائش تھی ۔

اس کے بعد جوں جوں ہمارے دورہ جاپان کی اطلاع ہمارے دشمنوں میں پھیلی لوگ فرمائشوں کی فہرست پہلے دیتے تھے اور مبارکباد بعد میں دیتے تھے کچھ ستم ظریف ایسے بھی تھے جو فرمائشوں کی فہرست دینے کے بعد مبارکباد دینا بھول جاتے تھے اور ہمیں مجبوراً انہیں یاد دلانا پڑتا تھا کہ وہ ایک خوشگوار فریضہ انجام دینا بھول گئے ہیں ۔ ہمیں بیس دن بعد جاپان میں قدم رنجہ فرمانا تھا اور اس مقصد کے لئے دوستوں سے سامان سفر مانگنا تھا ۔ چونکہ ہم سرکاری حیثیت میں باہر جارہے تھے اس لئے سفر کے دوسرے مرحلے تو فوراً طئے ہو گئے لیکن فرمائشوں کا سلسلہ دن بہ دن دراز ہوتا چلا گیا ۔ جاپان روانہ ہونے سے ایک دن پہلے ہم نے بڑی محنت سے دوستوں کی فرمائشوں کی فہرست مرتب کی تو پتہ چلا کہ حسب ذیل سامان جاپان سے ہمیں ہر حالت میں لانا ہے ۔

ٹرانزسٹر دستی ۱۵ عدد ۔ ٹرانزسٹر مع ٹیپ ریکارڈر ۱۰ عدد ۔ شفان کی ساڑیاں ۴۵ عدد ، کیالکو لیٹر ۲۵ عدد ، سیکو گھڑیاں خواتین کی ۱۰ عدد ، مردوں کی ۱۵ عدد ۔ ٹیلی ویژن کے چھوٹے سیٹ ۴ عدد ، ٹی سیٹ ۴ عدد ، ٹیپ ریکارڈر کے کیسٹ ۱۰۰ عدد ، جاپان کی چھتریاں ۲۰ عدد ، جاپانی موزے ۷۵ عدد متفرق سامان ۱۰۰ عدد ۔ جاپان کی گڑیاں ۲ عدد (ایک گڑیا ہمارے دوست اور کرم فرما جناب پی گنگا ریڈی وزیر سیول سپلائز آندھرا پردیش کیلئے اور دوسری گڑیا

ہمارے دوست قاضی سلیم کی لڑکی سلمیٰ کیلئے) جاپان کی گڑیوں کی فرمائش اب بھی ہمارے لئے ایک معمہ بنی ہوئی ہے۔ ہمارے کرم فرما جناب پی گنگا ریڈی، ہمارے جاپان روانہ ہونے سے پہلے دہلی آئے تو کہنے لگے "مجتبیٰ بھائی! آپ جاپان جارہے ہیں میری ایک چھوٹی سی فرمائش ہے کیا آپ پوری کرسکیں گے؟"

ہم نے کہا "آپ کیلئے تو ہم پورے جاپان کو اٹھا کر لاسکتے ہیں۔ یوں بھی ہم ایروں غیروں کے لئے پندرہ بیس ٹرانزسٹرز، تیس گھڑیاں، چالیس پچاس ساڑیاں اور نہ جانے کیا کیا جاپان سے لارہے ہیں۔ آپ تو ہمارے عزیز ترین دوست اور کرم فرما ہیں۔ آپ فرمائش کر کے تو دیکھئے" یہ سن کر ہمیں ایک کونے میں لے گئے اور آہستہ سے کان میں کہا "میرے لئے ایک اچھی سی جاپانی گڑیا لے آئیے"

ہم نے کہا "یہ کون سی مشکل بات ہے۔ اتفاق دیکھئے کہ آج ہی قاضی سلیم کی لڑکی نے بھی ہم سے ایک جاپانی گڑیا کی فرمائش کی ہے۔ جب ہم اس کے لئے ایک گڑیا خریدیں گے تو آپ کیلئے بھی ایک اور خرید لیں گے۔ بھلا یہ بات بھی کونے میں الگ لے جاکر کہنے کی ہے"۔

گنگا ریڈی صاحب بولے "مجتبیٰ بھائی! آپ کیسے مزاج نگار ہیں۔ میری جاپانی گڑیا اور قاضی سلیم کی لڑکی کی گڑیا میں کوئی فرق محسوس نہیں کرسکتے۔ خیر

آپ کی مرضی" ۔

اب جب کہ ہم جاپان پہونچ گئے ہیں ۔ ان کی بات اب بھی ہمارے لئے معمہ بنی ہوئی ہے ۔ چاہے کچھ بھی ہو ہم نے ٹھان لیا ہے کہ ان کیلئے اور قاضی سلیم کی لڑکی کیلئے دو عدد جاپانی گڑیاں ضرور لیتے آئیں گے کیونکہ یہاں آنے کے بعد ہم نے فرمائشوں کی فہرست کا جاپان کی مہنگائی کے پس منظر میں ٹھنڈے دل ودماغ سے جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ ہم اس فہرست میں سے صرف دو گڑیاں ہی خرید سکتے ہیں ۔

ہندوستان سے روانہ ہونے سے ایک دن پہلے جب ہم اپنے گھر میں فرمائشوں کی فہرست مرتب کر رہے تھے تو ہماری اہلیہ محترمہ نے اس فہرست کو دیکھ کر سوچا کہ لگے ہاتھوں فرمائشوں کی اپنی فہرست بھی تھمادیں ہم نے اس فہرست کا طیارے میں بغور مطالعہ کیا ۔ خاصی دلچسپ فہرست ہے اور اس کے مطالعہ سے ہمارا سفر خاصا آرام سے کٹا ۔ اس لئے کہ اس فہرست میں نہ کہیں ٹرانزسٹر ہے نہ ساڑی ۔ نہ ٹیلی ویژن ہے نہ جاپانی چھتری ہے ۔ بس ہم سے اتنی معصوم سی خواہش کی گئی ہے کہ ہم جاپان سے ۵۰ کیلو گرام گیہوں ، ۴۰ کیلو گرام چاول ، مونگ پھلی کا تیل چھ کیلو گرام ، نہانے کا صابن چھ ٹکیاں ، کپڑے دھونے کا صابن آٹھ ٹکیاں لے آئیں ۔ الغرض یہ فہرست ہوتے ہوتے ۱۰۰ گرام لونگ ، ۱۰۰ گرام الائچی اور ۱۰۰ گرام شاہ زیرے پر

ختم ہوگئی ہے ۔ البتہ جاپان پہنچنے کے بعد ہماری اہلیہ محترمہ نے فون پر اطلاع دی ہے کہ غلطی سے مہینے بھر کے سامان کی فہرست ہمارے ساتھ چلی گئی ہے اور جو چیزیں جاپان سے آنی ہیں ان کی فہرست بذریعہ ڈاک روانہ کی جارہی ہے ۔ اب جگر تھام کے بیٹھو میری باری آئی ۔ اور ہاں! ہمیں اپنے ایک ادیب دوست کی معصوم سی فرمائش بھی یاد آگئی ۔ انہیں جب پتہ چلا کہ ہم جاپان جارہے ہیں تو ہم سے کہا " تم جاپان جارہے ہو تو ایک چھوٹی سی فرمائش ہے " ۔

" ہم نے کہا " ارشاد ہو "

بولے " جاپان جانے سے پہلے یہ وعدہ کرتے جاو کہ تم جاپان کے بارے میں کوئی سفرنامہ نہیں لکھوگے "

ہم نے ان کی فرمائش کے بارے میں سنجیدگی سے غور کیا مگر جب ہم اپنے اتنے سارے دوستوں اور بہی خواہوں کی فرمائشوں کی تکمیل نہیں کررہے ہیں تو ان کی فرمائش کے بارے میں کیوں سنجیدہ ہوجائیں ۔ لگے ہاتھوں ایک مصرعہ یاد آگیا ۔ غالباً پنڈت ہری چند اختر کا ہے ۔ یہاں جاپان میں کوئی اردو کتاب بھی تو نہیں ملتی کہ جس کو شاعر کا صحیح نام معلوم کرنے کیلئے حوالے کے طور پر استعمال کرسکیں ۔ ۔ مصرعہ کچھ یوں ہے ۔

کہا جاپان کا ڈر ہے کہا جاپان تو ہوگا

اردو میں جاپان کے بارے میں غالباً یہ پہلا اور واحد مصرعہ ہے اور انشاء اللہ ہمارا سفرنامہ بھی اردو میں اپنی نوعیت کا جاپان کا پہلا سفرنامہ ہوگا۔

خوش رہو اہل وطن

دہلی سے ٹوکیو روانہ ہونے سے پہلے ہم نے اپنے ایک ایک دوست کو دس دس مرتبہ فون کرکے اچھی طرح بتادیا تھا کہ ہم ۲۸/ ستمبر کی رات میں دو بجے پان امریکن کی اڑان نمبر ۲ سے پرواز کر رہے ہیں - پالم کا ہوائی اڈہ شہر سے بہت دور ہے اور وقت بھی نامناسب ہے اسی لئے ہمیں چھوڑنے کیلئے ہوائی اڈے پر آنے کی زحمت نہ کرنا۔ بعض دوستوں سے تو پندرہ مرتبہ فون کرکے وعدہ لیا تھا کہ وہ ہمیں وداع کرنے کے لئے نہیں آئیں گے - اس لگاتار یاد دہانی کے بعد ہمیں یقین تھا کہ ہوائی اڈے پر دوستوں اور بہی خواہوں کا ایک جم غفیر ہوگا جو رومالوں کے پیچھے اپنی آنکھیں چھپائے بادیدہ نم ہمیں ہندوستان سے رخصت کریں گے اور ہم انہیں دلاسہ دیں گے کہ ۳۵ دن کی عارضی جدائی میں یوں اپنا کلیجہ چھلنی نہیں کرتے - مگر ہوائی اڈے پر پہونچے تو دیکھا کہ صرف تین دوست ہمیں وداع کرنے کیلئے آئے ہیں - ہندی کے ناول نگار پربھاکر دویدی تھے، انگریزی کے ایڈیٹر رگھونندن سہائے سکسینہ تھے اور تیسرے ہمارے حیدرآبادی دوست بشارت اللہ حسینی تھے - اتفاق سے یہ تینوں دوست ایسے تھے جنہیں ہم ہوائی اڈے پر آنے سے منع کرنا بھول گئے

تھے اگر خدا نخواستہ یہ غلطی کر بیٹھتے تو ان دوستوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے۔
پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ ہمارے دوست ہمارے مشوروں پر اب صدق دل سے عمل کرنے لگے ہیں۔ ہم نے اپنے سفر جاپان کیلئے بطور خاص پان امریکن کے طیارے کا انتخاب کیا تھا کہ دنیا کی بڑی ہوائی سردیس ہے، سفر کا مزہ آجائے گا پھر یہی وہ مشہور ہوائی سردیس ہے جو دنیا کے گرد پورا ایک چکر لگاتی ہے۔ پان امریکن کی اڑان نمبر ا سانفرانسسکو سے نکل کر ٹوکیو، ہانگ کانگ، بنکاک، دہلی، فرینکفرٹ اور لندن سے ہوتی ہوئی نیویارک پہنچ جاتی ہے یعنی مشرق سے مغرب میں جاتی ہے۔ اور اڑان نمبر ۲ نیویارک سے نکل کر الٹا چکر لگاتی ہوئی سانفرانسسکو پہونچ جاتی ہے۔ یعنی مغرب سے مشرق کی طرف جاتی ہے، ہم اس رات اڑان نمبر ۲ کے مسافر تھے۔ ہم پہونچے تو دوستوں نے بتایا کہ طیارہ آچکا ہے اور بس آپ ہی کا انتظار ہے۔ آپ پیش قدمی کریں تو طیارہ پرواز کرے۔ ہم نے دوستوں سے اجازت لی۔ اپنے وطن عزیز اور اردو زبان دونوں کو خدا حافظ کہا اور طیارے میں آن بیٹھے۔ پان امریکن کے طیارے 747 کا شمار دنیا کے بڑے طیاروں میں ہوتا ہے۔ اپنے ملک میں تو ہم وقتاً فوقتاً ایورو، بوئینگ، ایربس اور اسی قماش کے دیگر طیاروں کو بھگت چکے تھے لیکن 747 میں بیٹھنے کا پہلا تجربہ تھا۔ لہذا پہلے ایر ہوسٹس پر نظر ڈالنے کی بجائے طیارے پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ مسافروں پر بھی اچٹتی سی نظر ڈالنے

کا ارادہ تھا مگر مسافر اتنے کم تھے کہ ان پر نظر ڈالنے میں بڑی تکلیف کا سامنا کرنا پڑا ۔ ایک عجیب و غریب بات ہم نے یہ محسوس کی ہے کہ ہر ہوائی سفر میں ہمیں ہمیشہ طیارے کی کھڑکی کے برابر والی نشست ملتی ہے ۔ اس بار بھی وہی ملی ۔ طیارے نے جب اڑان بھری تو دو بج رہے تھے ۔ ہم نے سوئی ہوئی دہلی کو نیچے جھانک کر دیکھا ۔ بہت بھلی لگی ۔ پھر ہم نے طیارے کے اندر نظر ڈالی تو دیکھا کہ ہمارے برابر ایک انگریز بیٹھا ۔ انجینئرنگ کے موضوع پر کوئی کتاب پڑھ رہا ہے اور اطراف کی ساری نشستیں خالی ہیں ۔ ہم نے سوچا کہ چلو موصوف سے ان کے دیس کی باتیں کریں ۔ ان کی اور ان کے بال بچوں کی خیریت پوچھیں تاکہ سفر آسانی سے کٹ جائے ۔ بھلا ہوائی سفر میں کوئی انجینئرنگ کی کتاب پڑھتا ہے ۔

ہم نے پوچھا "آپ کہاں سے آرہے ہیں ؟" موصوف نے کتاب پر سے اپنی نظریں ہٹائے بغیر جواب دیا "لندن"

پوچھا "کہاں کا قصد ہے ؟" بدستور کتاب پڑھتے ہوئے بولے "بنکاک"

ان کی اس روکھائی کو دیکھکر ہمیں بھی تاؤ آگیا ۔ فوراً اپنے بیگ میں سے جاپان کے بارے میں ایک کتاب نکالی اور پڑھنا شروع کر دیا ۔ مقصد اس مطالعہ کا صرف موصوف کو یہ بتانا تھا کہ اگر آپ کتاب پڑھ سکتے ہیں تو ہمیں بھی کتاب پڑھنا آتی ہے ۔ مگر ابھی چند ہی لمحے گزرے تھے کہ ایر ہوسٹس ہماری اور

ہمارے بال بچوں کی خیریت پوچھنے آگئی ۔ اس نے آتے ہی ہم سے کہا " اگر آپ سو جانا چاہیں تو بندی آپ کیلئے چار نشستوں کے ڈانڈے ہٹا کر انہیں پلنگ میں تبدیل کر سکتی ہے ۔ اس وقت طیارے میں مسافر بھی کم ہیں اور رات بھی بہت ہو چکی ہے اور اب آپ کو سو جانا چاہیے "

ہم نے کہا " بی بی! آپ کی ذرہ نوازی کا شکریہ ۔ ہم اگر کبھی رات میں دو بجے تک جاگ لیں تو پھر ہمیں ساری رات نیند نہیں آتی ۔ لہذا ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو " تاہم وہ برابر اصرار کرتی رہی کہ ہم سو جائیں اور ہم بدستور اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہے ۔ اس کے بعد اس نے اپنی توجہ کتاب پڑھنے والے انگریز کی طرف مبذول کی اور انہیں بھی نیند اور آرام کے فوائد سے آگاہ کرنے لگی ۔ مگر ہم اس انگریز کی ثابت قدمی کی داد دیتے ہیں کہ اس نے کتاب پر سے نظر نہیں ہٹائی اور نہایت کرخت انگریزی میں کہا " جاو ہم نہیں سوتے " وہ وہاں سے بھاگی اور اپنے کیبن میں بیٹھکر کتابیں پڑھنے والے ہم دونوں مسافروں کو حیرت سے دیکھنے لگی ۔ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت طیارے میں ہم دو مسافروں اور ایک ایر ہوسٹس کے سوائے کوئی جاگ نہیں رہا تھا ۔ ہم دونوں مسافر سو جاتے تو کیا عجب کہ ایر ہوسٹس بھی سو جاتی ۔ ایک گھنٹہ تک ہم پڑھائی کے معاملہ میں انگریز کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے ۔ اتنے میں کیپٹن نے اعلان کیا کہ ہم کلکتہ پر سے گزر رہے ہیں اور اب خلیج بنگال میں داخل ہوا چاہتے ہیں ۔ اس کے بعد

بنکاک تک کا سفر سمندر کے اوپر سے طے ہوگا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی ہم نے کتاب پر سے نظر ہٹالی ۔ ایر ہوسٹس کو دیکھا ۔ بیچاری مظلوم ایر ہوسٹس اپنے کیبن میں چپ چاپ بیٹھی اونگھ رہی تھی ۔ ہم نے سوچا کہ پان امریکن ایرلائنس نے اتنی بھاری تنخواہ دے کر بیچاری کو ایر ہوسٹس مقرر کیا ہے تو کیوں نہ اس کی خدمات سے استفادہ کیا جائے ۔ اس غریب کو پتہ تو چلے کہ کسی کو اس کی حاجت ہے ۔ ہم نے گھنٹی دبائی تو وہ دوڑی چلی آئی ۔

ہم نے کہا "بی بی تمہارا اس طرح بیکار بیٹھے رہنا خدا کی قسم اچھا نہیں لگ رہا ہے ۔ جاو دوڑ کے ہمارے لئے کافی ہی لادو ۔ اور ہاں ٹھنڈا پانی بھی لیتی آنا" ۔ وہ جانے لگی تو انگریز مسافر نے بھی اپنی زبان کھولی اور بولا "ہمارے لئے بھی کافی لے آو" ۔ ہم جانتے ہیں کہ اس نے محض ہمیں یہ جتانے کیلئے کافی کا آرڈر دیا تھا کہ میاں بچو تم کافی پی سکتے ہو تو ہم بھی کافی پی سکتے ہیں ۔ غرض ہم دونوں میں کتابیں پڑھنے اور کافی پینے کا مقابلہ جاری ہی تھا کہ یکبارگی ہماری نظر کھڑکی کے باہر جو پڑی تو دیکھا کہ آسمان پر سورج کی سواری کے نکلنے کا اعلان ہورہا ہے گھڑی دیکھی تو چار بج رہے تھے ۔ ہم نے کہا یا اللہ یہ کیا ماجرا ہے ۔ آج سورج کو دھرتی کے نیچے سے نکل آنے میں اتنی عجلت اتنی بے قراری کیوں ہے ۔ ہمارے ملک کے مرغ تو ابھی سو رہے ہیں اور یہاں کے مرغوں نے ابھی سے بانگ دینا شروع کردیا ہے ۔ ذرا غور کیا تو احساس ہوا کہ سارا قصور مرغوں کا

نہیں جغرافیہ کا ہے ۔ ہم اپنی سواری میں سورج کی طرف بڑھ رہے تھے اور سورج اپنی سواری میں ہماری طرف بڑھ رہا تھا چند ہی منٹوں میں سورج فٹ بال کی طرح سمندر میں سے اچھل آیا ۔ قدرت کی کتاب ہمارے سامنے کھل گئی تو ہم نے اپنی کتاب بند کر دی اور لگے کھڑکی سے باہر جھانکنے ۔ مگر انگریز بدستور اپنی کتاب میں ڈوبا رہا ۔ جی میں آیا کہ اس سے کہیں کہ میاں ایک نظر ادھر بھی ڈالو کیسا حسین منظر ہے ۔ تمہارا ایک شاعر گزرا ہے ورڈسورتھ ، وہ اگر آج ہمارا ہمسفر ہوتا تو ہمیں کھڑکی سے ہٹا کر ہماری جگہ خود بیٹھ جاتا ۔ انجنیرنگ کی کتاب ہرگز نہ پڑھتا ۔ تم ورڈسورتھ کو بھول گئے مگر ہم نہیں بھولے ۔ ابھی طیارے کو بنکاک پہنچنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا ۔ سمندر چاندی کی چادر کی طرح نیچے بچھا ہوا تھا اور کہیں کہیں کوئی جزیرہ اس چادر میں پیوند کی مانند نظر آجاتا تھا ۔ تھائی لینڈ کی خوبصورت سرزمین کو ہم ۴۵ ہزار فیٹ کی بلندی سے دیکھتے رہے ۔ ناریل کے درختوں اور جگہ جگہ بہتی ہوئی ندیوں اور نہروں کے جال نے آنکھوں میں وہ سرور اور دل میں وہ گداز پیدا کیا کہ جی چاہا آج کی صبح کی کبھی شام نہ ہو ۔ یہ صبح یوں ہی ساری کائنات پر آخری سانس تک پھیلی رہے ۔ ہم میں ایک بری عادت یہ ہے کہ شاعروں سے نفرت کرنے کے باوجود کبھی کبھی ہم خود بے ارادہ طور پر شاعر بننے لگ جاتے ہیں ۔ ہم نے اپنے آپ کو خبردار کیا کہ میاں یہ کیا ہو رہا ہے ۔ ذرا سنبھالو اپنے آپ کو ۔ بنکاک کا ہوائی اڈہ سامنے آچکا تھا ۔

ہوائی اڈے پر اترنے سے پہلے طیارے نے بنکاک کا ایک چکر لگایا اور ہم نے سچ مچ بنکاک پر ایک طائرانہ نظر ڈالی ۔ ہم اڑنے والے پنچھی ہی تو تھے ۔ کسی نے سچ کہا ہے بنکاک مشرق کا وینس ہے ۔ جگہ جگہ نہروں کا جال ، چاول کے ہرے بھرے کھیت ، ناریل کے جھنڈ ، سبزہ ہی سبزہ ، قسمت کی لکیروں کی طرح پھیلی ہوئی سڑکیں ۔ بنکاک پر طیارہ ایک گھنٹہ کیلئے رکا ۔ ہمارے برابر والا انگریز مسافر کتاب پڑھتے پڑھتے اپنا بیگ اٹھا کر چلا گیا ۔ تھائی لینڈ کی پستہ قد محنت کش لڑکیوں کا ایک غول طیارے میں آیا اور اس نے طیارے کی صفائی شروع کر دی ۔ پھر نئے مسافر آئے ہمارے برابر والی نشست پر اک نوجوان جاپانی آکر بیٹھ گیا ۔ مگر ہم نے ٹھان لیا تھا کہ اب کسی مسافر سے بات ہنیں کریں گے ۔ لیکن جاپانی نوجوان نے آتے ہی ہم سے کہا "گڈ مارننگ" ہم نے جواباً کہا "اوہائیو گزای مس" (جاپانی میں صبح کا سلام) ۔

اس نے حیرت سے کہا "آپ جاپانی جانتے ہیں" ؟

ہم نے کہا "ہئی ، ہئی" (جاپانی جی ہاں) ۔

اس نے کہا "تب تو سفر کا مزہ آجائے گا"

ہم نے کہا "دوموآری گاتو گزائی مس" (جاپانی میں آپ کا بہت شکریہ)

اس نے کہا "ارے آپ تو سچ مچ جاپانی جانتے ہیں" ۔

یں اں ی

۔ لتے آختلے

اس پر ہم نے انگریزی میں کہا" بھیا جتنی جاپانی ہم جانتے تھے وہ ان تین جملوں میں خرچ ہو چکی ہے ۔ لہذا کوئی اور زبان جانتے ہو تو اس میں بات کرو ورنہ تم اپنی جگہ خوش اور ہم اپنی جگہ خوش" ۔

وہ بولا" میں تھوڑی سی انگریزی جانتا ہوں ۔ بنگالی بھی تھوڑی سی آتی ہے بنگلہ دیش سے آرہا ہوں ۔ وہاں ایک فرم میں ایک سال کیلئے انجینئرنگ ایکسپرٹ بن کر گیا تھا ۔ اب اپنے وطن واپس جارہا ہوں" ۔

ہم نے کہا" جس نشست پر آپ بیٹھے ہیں وہ غالباً انجینیئروں کے لئے محفوظ ہے ۔ آپ سے پہلے ایک انگریز انجینیئر بیٹھا تھا ۔ اب آپ آئے ہیں ۔ اس نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا" آپ دلچسپ آدمی معلوم ہوتے ہیں" ۔

ہم نے کہا" کیا کریں زبان یار ترکی ہے ۔ اگر تم بھی ہماری طرح اہل زبان ہوتے تو اردو محاوروں کو بگھار دے کر اپنی بات کو چٹخارے دار بناتے اور تب تمہیں پتہ چلتا کہ ہم کتنے دلچسپ آدمی ہیں ۔ بہر حال اب تمہارے دیس کو جارہے ہیں اور ہماری جھولی میں تمہاری زبان کے دو چار جملے ہیں" ۔

طیارہ بنکاک سے اڑ چکا تھا اور اب کچھ دو چار ہم صورت نہ سہی ہم سیرت طیارے میں آن بیٹھے تھے ۔ پھر ناشتے کی باری آئی اور ہمارے سامنے ناشتے کی کشتی رکھی گئی تو دیکھا کہ سور کے گوشت پر دو تلے ہوئے انڈے رکھے ہیں ۔ ہم نے ایر ہوسٹس سے کہا" بی بی! ہم سور کا گوشت نہیں کھاتے ۔ لہذا ہمارے لئے

صرف انڈے لے آو۔"

وہ بولی "ایسی بات ہے تو انڈے ہٹا لیجئیے۔ سور کا گوشت میں لے جاونگی"

ہم نے کہا" محترمہ سور کے گوشت پر انڈے رکھے ہوئے ہیں۔ اب ہم انہیں کیسے کھا سکتے ہیں"

ایر ہوسٹس نے کہا" میں مجبور ہوں۔ بنکاک سے ہمیں اسی قسم کا ناشتہ ملا ہے ہر کھانے کا ڈیزائن اور لے آوٹ یہی ہے یعنی سور کا گوشت نیچے اور تلے ہوئے انڈے اس کے اوپر۔"

ہمارے جاپانی دوست آئی یو کو غصہ آگیا۔ بولے " اتنی بڑی ایر لائنس ایک مسافر کو کھانا بھی نہیں کھلا سکتی" اس کے بعد ہمارے جاپانی دوست نے اپنے بیگ میں سے بنکاک کا ایک بڑا کیک نکالا۔ پھر سوکھے بادام اخروٹ اور نہ جانے کیا کیا چیزیں ہمیں پیش کرنے لگے۔ ہر بار کہتے یہ میری طرف سے تحفہ ہے۔ بنکاک سے ہانگ کانگ تک کا سفر تقریبا تین گھنٹوں کا ہوتا ہے۔ ان تین گھنٹوں میں ہمارے دوست نے کھانے پینے کی اتنی چیزیں تحفے میں پیش کیں کہ ہمیں جاپان آئے ہوئے دس دن ہو چکے ہیں اور اب تک ہم ان کے بادام اور اخروٹ کھائے چلے جا رہے ہیں۔ جاپانیوں کی تحفہ دینے کی عادت کے بارے میں کبھی تفصیل سے لکھیں گے۔

صاحبو! مہربانو! قدردانو! ہوشیار! خبردار۔ اپنے ہوش و حواس پر قابو رکھو

اگر تمہارے پاس اخلاق کا دامن ہے تو اسے مضبوطی سے تھامے رکھو، اپنا ایمان سنبھالو، اپنے نفس کو جتنا مار سکتے ہو مارو۔ ابھی کچھ ہی دم میں ہمارا طیارہ ہانگ کانگ پر اترنے والا ہے۔ ہانگ کانگ کا حال بعد میں لکھیں گے۔ ہم میں اس وقت اتنی تاب ہے نہ مجال کہ ہانگ کانگ کے بارے میں کچھ عرض کر سکیں۔

ٹوکیو میں ہمارا ورود مسعود

ہم نے پچھلی قسط میں آپ کو ہانگ کانگ کی آمد کے بارے میں حسب استطاعت خبردار کیا تھا۔ ہانگ کانگ ملک کیا ہے، بس ایک جزیرہ سا ہے۔ اسے سمٹا ہوا دل عاشق کہہ لیجئیے۔ جب ہمارا طیارہ نیچے اترنے لگا تو پورا جزیرہ ہماری نظروں کے سامنے تھا۔ فلک بوس عمارتوں کو اپنی ہتھیلی میں سجائے ہوئے سمندر کی لہروں سے کھیلتا ہوا یہ جزیرہ اتنا خوبصورت لگا کہ بس کچھ نہ پوچھئے۔ یہاں برسوں انگریزوں کی حکمرانی رہی ہے اور اب بھی ایک اعتبار سے ہے۔ باشندے زیادہ تر چینی ہیں۔ چینی زبان بولتے ہیں اور انگریزی پر بھی ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ یہاں سے چین کی سرحد بھی دکھائی دیتی ہے۔ بڑا کاروباری مرکز ہے۔ ہانگ کانگ کی رونق وہاں کے باشندوں سے نہیں بلکہ ان سیاحوں سے ہے جو آتے ہوئے اپنی جیبوں میں دولت اور دلوں میں ارمان بھر کر لے آتے ہیں۔ چونکہ ہانگ کانگ کی بندرگاہ فری پورٹ ہے، اس لئے ہر کوئی منہ اٹھائے چلا آتا ہے۔ یہاں ہر چیز بکتی ہے۔ ہمارے ایک دوست اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں کہ دو سال پہلے ہانگ کانگ کے ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور میں سامان خریدنے گئے۔ چیزیں الٹ پلٹ کر دیکھیں۔ کوئی شئے پسند نہ آئی۔ اچانک سلیز گرل پر جو نظر پڑی تو وہ پسند آگئی۔ لہذا سلیز گرل کو خرید کر لے گئے۔

ہانگ کانگ سے کوئی شخص خالی ہاتھ واپس نہیں جاتا۔ ہر مراد پوری ہو جاتی ہے ۔ کاش سکندر کو ہانگ کانگ جانے کا موقعہ ملتا۔ ہمارا طیارہ یہاں دو گھنٹہ ٹھہرنے والا تھا ۔ہمیں یہ سہولت دی گئی کہ ہم چاہیں تو طیرانگاہ کے ڈیوٹی فری بازار سے چیزیں خرید لیں ۔ دو گھنٹے گزارنے کا معاملہ تھا سو ہم اپنے جاپانی دوست آئی یو کے ساتھ ڈیوٹی فری بازار میں کھو گئے ۔یہاں دنیا جہاں کی چیزیں سجی ہوئی تھیں ہم نے زندگی میں کبھی اس طرح شاپنگ نہیں کی جس طرح کی جاتی ہے ۔ بہت شاپنگ کی تو سگریٹ خریدے یا پان خریدے ۔ اس کے علاوہ شاپنگ کے میدان میں ہمارا کوئی عملی تجربہ نہیں ہے ۔ لہذا ہر دوکان کے سامنے یوں کھڑے رہے جیسے بین کے سامنے بھینس کھڑی ہوتی ہے ۔ تاہم سگریٹوں کی شاپنگ کے معاملہ میں اپنے دیرینہ تجربہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم نے اتنے سارے سگریٹ خرید لئے کہ جب ہم طیارہ میں واپس ہوئے تو ہمارے دونوں کندھوں اور دونوں ہاتھوں میں سگریٹوں سے بھری ہوئی تھیلیاں لٹک رہی تھیں۔

ہانگ کانگ کے ہوائی اڈہ کے بارے میں ایک بات اور عرض کر دیں کہ یہ بالکل سمندر سے متصل ہے ۔ لہذا جب طیارہ ہوائی اڈہ پر اترنے لگتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے طیارہ ہوائی اڈہ پر نہیں اتر رہا ہے بلکہ سمندر میں گر رہا ہے ۔ہمیں بھی اس منظر سے بڑی پریشانی ہوئی تھی ۔آپ کبھی ہانگ کانگ

جائیں تو ہوائی اڈہ کی اس ہئیت ترکیبی سے بالکل پریشان نہ ہوں - اللہ نے چاہا تو آپ زمین پر ہی اتریں گے - غرض ڈھائی گھنٹوں کے بعد جب ہمارا طیارہ ٹوکیو کی طرف روانہ ہوا تو کچھ نہ پوچھئے کہ طیارہ میں کیا حالت تھی - تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی - اب زیادہ تر مسافر جاپانی تھے - اور پان امریکن ہوائی سروس کو جاپانیوں پر بڑا ترس آتا ہے - ترس کیوں نہ آئے جاپانی آخر کو ترقی یافتہ ملک کے باشندے جو ٹھہرے - لہذا طیارہ کے عملے نے ہانگ کانگ کے بعد آداب مہمان نوازی یکسر بدل دیئے - وہ بنکاک والی بات نہیں تھی - بنکاک کے تجربہ کے پس منظر میں لنچ کے وقت ہم نے ڈرتے ڈرتے ایر ہوسٹس کو یاد کیا - اور گزارش کی کہ ہمیں سور کے گوشت سے محفوظ رکھا جائے - اس نے پوچھا "آپ کیا کھانا پسند کریں گے؟" ہم نے کہا مرغ مچھلی بیف یا سبزی جو کچھ بھی آپ کے بس میں ہو وہ ہمیں دے دیجئے مسافر ہیں آپ کے حق میں دعا کریں گے" - تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئی تو دیکھا کہ وہ اپنے لبوں کی آخری حدوں تک ایک لمبی سی مسکراہٹ چہرے پر سجائے اور ہاتھ میں ایک بڑی سی کشتی پکڑے خراماں خراماں چلی آرہی ہے - کشتی پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ اس میں مرغ بھی ہے مچھلی بھی ہے بیف بھی ہے اور سبزی بھی - ہم نے کہا" اتنی ساری چیزوں کا ہم کیا کریں گے؟" اپنی مسکراہٹ میں ایک نئی طرح داری اور دلنوازی پیدا کرتے ہوئے معصومیت سے بولی" آپ کھائیں گے اور کیا؟ ہمارے جاپانی

دوست نے مداخلت کرتے ہوئے کہا" محترمہ! آپ سے پہلے جو ایر ہوسٹس
یہاں تھیں انہوں نے تو انہیں صبح میں بھوکا ہی رکھا تھا۔ مگر آپ کا لطف و کرم
کیا معنی رکھتا ہے" ہم نے اپنے جاپانی دوست کو ٹوکتے ہوئے کہا" بھیا! کیوں
بیچاری کا دل دکھاتے ہو۔ ہم جہاں بھی گھنی چھاؤں دیکھتے ہیں وہاں بیٹھ جاتے
ہیں۔ چھاؤں نہ ملے تو سورج سے بھی آنکھیں ملالیتے ہیں۔ ان کا کرم ہے کہ
انہوں نے ہمیں اس قابل سمجھا ورنہ ہم کیا اور ہماری بساط کیا۔"

ہانگ کانگ سے ٹوکیو تک ساڑھے تین گھنٹوں کا سفر کس طرح کٹا ہمیں
یاد نہیں۔ ہانگ کانگ کے بعد طیارہ میں جاپانی زبان میں بھی اعلانات ہونے
لگے۔ یعنی جاپانی میں ہمیں بتایا گیا کہ ایمرجنسی کی صورت میں ہمیں طیارے
کے کون سے دروازہ سے باہر کودنا چاہئیے، آکسیجن کی کمی کی صورت میں ہمیں کیا
کرنا چاہئیے، ہم نے پہلے پہل جاپانی زبان یہیں سنی۔ کانوں کو عجیب و غریب لگی
جب ہم ٹوکیو کے بین الاقوامی ہوائی اڈہ" نریتا" کے قریب پہونچے تو شام ہو رہی
تھی۔ مقامی وقت کے مطابق ساڑھے چار ہوں گے طیارہ نے پھر ایک چکر
ہوائی اڈہ کا لگایا اور اسی بیچ ہمارے جاپانی دوست نے ایک مرحلہ پر ایک پہاڑ
کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا" وہ دیکھو جاپان کا شہرہ آفاق پہاڑ فیوجی نظر آرہا
ہے" ہم نے دیکھا کہ بڑا بردبار اور سنجیدہ پہاڑ ہے۔ سر پر برف کی ٹوپی پہنے چپ
چاپ کھڑا گیان دھیان میں مصروف ہے۔ پھر ہم نے جدھر نظر دوڑائی ادھر

چھوٹے چھوٹے پہاڑ اور ان پہاڑوں کے دامن میں چھوٹے چھوٹے جاپانی گھر نظر آئے ۔ہماری آنکھوں نے پہلے پہل جاپان کو اسی طرح دیکھا ۔ تھوڑی دیر بعد ہم ٹوکیو کے بین الاقوامی ہوائی اڈہ نریتا پر تھے ہم نے سوچا طیارہ پر سیڑھی لگ جائے تو ہم بھی نیچے اتریں گے ۔ مگر پتہ چلا کہ یہاں طیاروں کو سیڑھی لگانے کا رواج نہیں ہے ۔ طیارہ خود ایک ایسے گلیارے سے جا لگتا ہے ۔.جہاں سے آپ خود بخود چلتے ہوئے راستہ پر کھڑے ہو کر کہیں بھی جا سکتے ہیں ، یہاں آپ کو قلی کوئی نہیں ملے گا ۔ اپنا سامان آپ اٹھائیے اور خود کار راستہ پر اسے رکھکر کھڑے ہو جائیے ۔ راستہ بھی چلے گا آپ بھی چلیں گے ۔ اور سامان بھی چلے گا ۔ ہم جہاں بھی جاتے ہیں ، اردو شاعری ہمارے ساتھ چلی آتی ہے ۔ خود کار راستہ پر چلتے ہوئے (اگر آپ سے چلنا کہیں) ہمیں شاہد صدیقی مرحوم کا ایک شعر یاد آگیا

ایک پل کے رکنے سے دور ہو گئی منزل
صرف ہم نہیں چلتے ، راستے بھی چلتے ہیں

ہمیں کیا پتہ تھا کہ شاہد صدیقی کے اس شعر کی صداقت پر ایمان لانے کیلئے بالآخر ہماری قسمت میں جاپان آنا لکھا تھا ۔ بڑی دیر تک راستہ چلتا رہا اور ہم ساری حیات اور ساری کائنات کو جو دو بیگس پر مشتمل تھی ساتھ لے کر چلنے کے وہم میں مبتلا رہے ۔ ٹوکیو کے نریتا ہوائی اڈہ کا شمار دنیا کے سب سے

اچھے اور نوجوان ہوائی اڈوں میں ہوتا ہے ۔ مئی ۱۹۷۸ء میں اس ہوائی اڈہ نے کام کرنا شروع کیا ۔ اور یہ ٹوکیو کے جنوب مشرق میں ۶۶ کیلومیٹر دور واقع ہے ۔ یہاں دن بھر میں کوئی ۲۰۰ طیارے دنیا کے کئی ممالک سے آتے ہیں ۔ بڑی چہل پہل اور رونق لگتی ہے ۔ جاپان کی چکاچوند کردینے والی روشنیوں سے ہماری شناسائی یہیں ہوئی ۔ ہمیں کسٹم کی رسومات پوری کرنا تھیں ۔ اور ہم سخت پریشان تھے ۔ اس لئے نہیں کہ ہم اپنے ساتھ افیوں یا چرس لے آئے تھے بلکہ اس لئے کہ ہمارے بیگ میں جو سامان تھا وہ اس قابل نہیں تھا کہ کوئی جاپانی اسے دیکھ سکے ۔ تین معمولی سے سوٹ تھے تین بنیانیں تھیں (بشمول ایک پھٹی ہوئی بنیان کے) اور طباعت واشاعت سے متعلق کتابیں ہی کتابیں تھیں ۔ کسٹم کے جاپانی کلرک نے جو انگریزی جانتا تھا ہم سے پوچھا "آپ کو کچھ ڈکلیر کرنا ہے" ہم نے کہا "غریب آدمی ہیں ، اپنی شرافت کے سوائے اور کیا ڈکلیر کرسکتے ہیں" وہ بولا "آپ کے بڑے بیگ میں کوئی قابل اعتراض چیز تو نہیں ہے ۔ البتہ آپ کے ہینڈ بیگ میں کوئی چیز نظر آتی ہے" موصوف نے کسی الکٹرانک آلے سے اس قابل اعتراض چیز کا پتہ چلا لیا تھا ۔

ہم نے کہا "بالکل بجا فرمایا آپ نے ۔ ہمارے ہینڈ بیگ میں ہمارے مزاحیہ مضامین کے دو مجموعے ہیں جنہیں ہم نے بس یونہی اپنے ساتھ رکھ لیا تھا ۔ چاہیں تو آپ انہیں ضبط کرلیں ۔ یوں بھی جاپان میں اردو کتابوں کا کیا کام"

وہ بولا "آپ کی کتابوں کی کوئی اہمیت نہیں ۔ بے ضرر سی چیزیں ہیں ۔ البتہ کچھ چیزیں ہیں جو سیاہ رنگ کی ہیں " تب ہمیں خیال آیا کہ موصوف کا اشارہ بیدری صنعت کے سامان کی طرف ہے ۔ ہم جاتے ہوئے اپنے ساتھ بیدری صنعت کی کئی چیزیں جیسے جوتے میں بنے ایش ٹرے، بٹن، ٹائی پن اور ڈبیاں لے گئے تھے اپنے جاپانی دوستوں کو تحفے کے طور پر پیش کرنے کیلئے ۔ ہم نے فوراً اپنا ہینڈ بیگ کھولا اور بیدری صنعت کا سامان نکال نکال کر اس کی خدمت میں پیش کرنے لگے ۔ وہ حیرت سے انہیں دیکھتا رہا، پھر بولا " بہت خوبصورت چیزیں ہیں ۔ آپ ہندوستانی اتنی خوبصورت چیزیں کیسے بنالیتے ہیں اور پھر مجھے حیرت ہے کہ اس دھات کا رنگ اتنا سیاہ کیسے ہوگیا ۔ "

ہم نے اپنا سینہ پھلا کر کہا " ایسی چیزیں بنانا ہم ہندوستانیوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے ۔ رہا یہ سوال کہ یہ دھات سیاہ رنگ کی کیسے بن گئی تو بھیا! یہ ہمارا ٹریڈ سیکریٹ ہے ۔ اگر آپ کو بتادیں تو ہماری کیا انفرادیت رہ جائے گی ہم نے بیدری سامان میں اس کی گہری دلچسپی کو دیکھکر ایک ایش ٹرے اس کی خدمت میں پیش کرنے کی کوشش کی مگر اس نے لینے سے صاف انکار کردیا ۔ بہت سمجھایا کہ یہ تحفہ ہے اور ہمارے ہاں کسٹم آفیسروں کو تحفے پیش کرنے کا رواج عام ہی نہیں لازمی مضمون کی حیثیت رکھتا ہے ۔ آپ بھی لے لیجئیے ۔

وہ بولا " نہیں جیسی آپ کی انفرادیت ہے ویسی ہماری بھی انفرادیت

ہے" خیر ہم وہاں سے سامان اٹھا کر بھاگے۔ جہاں جاتے دروازے خود بخود کھل جاتے۔ جاپان کی آٹومیٹک زندگی سے یہ ہمارا پہلا واسطہ تھا۔ اگرچہ ہم ٹوکیو پہونچ چکے تھے مگر پھر بھی "ہنوز دلی دور است" والا معاملہ درپیش تھا کیونکہ ٹوکیو ابھی ہم سے ٦٦ کیلو میٹر دور تھا ایشیائی ثقافتی مرکز نے ہمیں لیموزین بس کے ٹکٹ پہلے ہی بھیج دئیے تھے اور ہمیں حکم دیا گیا تھا کہ ہم اس میں بیٹھ کر ٹوکیو کے سٹی ایر ٹرمنل پہنچ جائیں اور پھر اس کی دوسری منزل کے انکوائری کاونٹر پر آجائیں۔ وہاں کوئی نہ کوئی ہمارا منتظر ہوگا۔ ہم نے لیموزین بس میں سامان رکھا اور بیٹھ گئے۔ جاپانی اپنی بسیں بھی طیاروں کی طرح چلاتے ہیں۔ باضابطہ اعلان ہوتا ہے کہ یہ فاصلہ کتنی دیر میں طے کریں گے۔ موسم اور وقت کے بارے میں بتایا جاتا ہے۔ ایمرجنسی کی صورت میں بس سے باہر نکلنے کی ترکیبیں بتائی جاتی ہیں۔ ڈرائیور اگرچہ موجود تھا مگر اس کا کام بٹن دبانا زیادہ اور بس چلانا کم تھا۔ اندھیرا ہو چکا تھا اور جاپانیوں کو اندھیرے سے سخت نفرت ہے لہذا اپنی سڑکوں اور گھروں کو اتنا روشن رکھتے ہیں کہ آدمی کو اپنی روشنی طبع کا استعمال کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ ہمیں جاپان آئے ہوئے آج ١٣ دن ہوگئے ہیں۔ اور اس بیچ میں ایک بار بھی ہمیں اپنی روشنی طبع کا استعمال کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ غرض روشنیوں میں جگمگاتے اور روشنیوں میں نہاتے ہوئے ہم ٹوکیو ایر ٹرمنل اسٹیشن پہنچے۔

جاپان کی گھڑیوں میں شام کے ۷ بج رہے تھے۔ اور ہماری گھڑی ہندوستان میں دن کے 2 1/2 - 4 بجارہی تھی۔ ہم بڑے ابن الوقت ہیں۔ لہذا فوراً اپنی گھڑی کو جاپانی وقت کے مطابق کیا پھر اس مقررہ مقام پر پہونچے جس کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ کوئی وہاں ہماری راہ میں آنکھیں بچھائے کھڑا ہوگا۔ جب ہم دوسری منزل پر پہونچے تو دیکھا کہ ایک نوجوان جاپانی لڑکی ہماری تصویر اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہر مسافر کو بڑی بے تابی کے ساتھ تاک رہی ہے۔ ہمیں اس کی بے تابی بہت بھلی لگی جیسے ہی اسکی نظر ہم پر پڑی، اس نے اپنی کمر کو دہرا کیا اور ۹۰ درجہ کا زاویہ بنا کر تعظیماً جھک گئی۔ ہم نے کہا "کمبنوا" ۔ (جاپانی میں شام کا سلام) ۔

وہ بولی "آپ حسین سان ہیں" (جاپانی میں سان، صاحب کو کہتے ہیں) ہم نے اثبات میں سر ہلایا تو بولی "میں مس کمورا ہوں، یونیسکو کے ایشیائی ثقافتی مرکز سے آپ کے استقبال کیلئے آئی ہوں"

ہم نے کہا "تو پھر کرو ہمارا استقبال ۔"

ہنس کر بولی "کچھ دیر توقف کیجئے ایشیائی ثقافتی مرکز کے بک ڈیولپمنٹ ڈیویژن کی سربراہ مسز آسانو بھی آپ کے استقبال کیلئے آئی ہیں اور وہ دوسری طرف آپ کو دیکھنے گئی ہیں"

ٹوکیو میں یاد ابن انشا کی

ناظرین کرام! ہم اس وقت دنیا کے سب سے بڑے اور سب سے مہنگے شہر میں ہیں ۔ مہنگائی کا یہ عالم ہے کہ اس شہر میں ہمیں اپنے سوا کوئی اور سستی چیز نظر نہیں آتی ۔ ٹوکیو کے نریتا ایر پورٹ پر جب ہم اترے تھے تو تب ہی ہماری آنکھیں کھل گئی تھیں ۔ جب ہم ایشیائی ثقافتی مرکز کے بک ڈویژن کی سربراہ مسز آسانو کے ساتھ ٹوکیو گرین ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے تو ہماری آنکھیں مزید کھلتی چلی گئیں ۔ صاف شفاف اور کشادہ سڑکیں روشنی میں اس طرح ہنا رہی تھیں کہ اگر سوئی بھی سڑک پر گری ہو تو صاف نظر آجائے ۔

بجے سجائے بازاروں پر حیرت کی نظر ڈالتے ہوئے ہم ٹوکیو گرین ہوٹل پہونچے ۔ یہ ہوٹل مرکزی ٹوکیو میں واقع ہے ۔ مسز آسانو نے ہمیں یہ خوشخبری بھی سنائی کہ شہنشاہ جاپان کا محل بھی پڑوس ہی میں واقع ہے ۔ ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا ۔ زندگی بھر ہمیں ایک اچھے پڑوسی کی تلاش رہی ہے جو کبھی میسر نہ آسکا ۔ شہنشاہ جاپان کے پڑوسی بن کر کچھ دن آرام سے گزار لیں گے ۔ ٹوکیو گرین ہوٹل کئی منزلہ عمارت ہے ۔ ہمیں اس کی چوتھی منزل میں ایک کمرہ ملا نام چونکہ گرین ہوٹل ہے اسلئے بڑا سرسبز و شاداب ہوٹل ہے ۔ یہاں کی ہر چیز ہری ہے کچھ دن بعد ہمیں اپنا رنگ بھی طوطے کی طرح ہرا نظر آنے لگا تھا ۔ ٹوکیو

کے بارے میں ہی کیا بلکہ سارے جاپان کے بارے میں یہ عرض کردیں کہ جاپان کے ۸۰ فیصد علاقے پر پہاڑ پھیلے ہوئے ہیں ۔ ۲۰ فیصد علاقہ میدانی ہے جس پر سارے جاپانی مل جل کر رہتے ہیں ۔ وہ تو اچھا ہے کہ جاپانیوں کا قد چھوٹا ہوتا ہے ورنہ ان سب کا مل جل کر رہنا دشوار ہو جاتا ۔ ادب میں ہمارا قد جو کچھ بھی ہے اس کے بارے میں آپ بخوبی جانتے ہیں ۔ لیکن ہمارا جسمانی قد پھر بھی اتنا بلند نہیں ہے ، بس ۵ فٹ ۱۱ انچ کا قد ہے ۔ پھر بھی ٹوکیو کی سڑکوں پر ہم نکلتے ہیں تو اپنی قد آور شخصیت کے باعث لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں ۔ کچھ جاپانی دوستوں کا کہنا ہے کہ جب سے ہم ٹوکیو آئے ہیں ٹوکیو بھرا پرا سا نظر آنے لگا ہے ۔ حالانکہ آبادی اور علاقہ کے لحاظ سے یہ دنیا کا سب سے بڑا شہر ہے ٹوکیو کی آبادی ایک کروڑ سے زیادہ ہے ۔ اور ہر دسواں جاپانی ٹوکیو میں رہتا ہے رہنے کی جگہ کی قلت کے باعث جاپانی اپنی زمین کے ایک ایک انچ کا فائدہ اٹھاتا ہے ۔ جاپانیوں کی ہر چیز چھوٹی ہوتی ہے ۔ سوائے کردار کے ۔ ہم جس ہوٹل میں ٹھہرے ہیں خود اس کا حال سن لیجئیے کہ جب ہم اپنے کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ اس میں ہر سہولت موجود ہے ۔ ٹیلی ویژن ہے ، ٹیلیفون ہے ، کمرے سے ملحق باتھ روم بھی ہے ، باتھ روم میں نہانے کا ٹب بھی موجود ہے ۔ پھر پورا کمرہ ایرکنڈیشنڈ بھی ہے ۔ اس میں لکھنے پڑھنے کیلئے ایک چھوٹی سی میز بھی ہے ۔ حد تو یہ ہے کہ ایک کرسی بھی موجود ہے ۔ بس ایک

تکلیف یہ ہے کہ جب بھی ہم صبح اٹھکر اپنے بستر میں بھرپور انگڑائی لیتے ہیں (جس کی عادت ہمیں برسوں سے ہے) تو ہماری انگڑائی کبھی ٹیلی ویژن سے ٹکرا جاتی ہے اور کبھی اس انگڑائی میں ٹیلیفون اٹک جاتا ہے۔ دو تین دن تک اپنی انگڑائی کے ذریعے ٹیلیفون کے ریسیور کو گرانے کے بعد ہم نے اب یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ آنکھ کھلتے ہی لپک کر ہوٹل کے کاریڈور میں چلے جاتے ہیں اور دو چار بھرپور انگڑائیاں لے کر پھر اپنے کمرے میں واپس آجاتے ہیں۔ صرف ۳۵ دنوں تک ٹوکیو میں رہنے کی خاطر ہم اپنی برسوں کی انگڑائی سے دستبردار ہونے سے تو رہے۔ اس ہوٹل کی تنگ دامانی کا حال کبھی ہم بعد میں بیان کریں گے۔ کیوں کہ اس حال کو اپنے مخصوص انداز میں بیان کرنے کے بعد ایشیائی ثقافتی مرکز کے ڈائرکٹر جنرل مسٹر ریوجی ایٹو نے ہمیں مزاح نگار تسلیم کر لیا تھا (آپ نے ابھی تک تسلیم نہیں کیا ہے تو ہمیں اس کی کوئی فکر نہیں ہے ٹوکیو والوں نے تو اردو جانے بغیر ہی ہمیں مزاح نگار مان لیا ہے، جاپانی بڑے مردم شناس ہوتے ہیں) آپ یہ نہ سمجھیں کہ ہم کسی معمولی ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔ روزآنہ پانچ ہزار "ین" (جاپانی سکہ) ادا کرتے ہیں اور وہ بھی صرف رہنے کا (یہ کرایہ بھی یونیسکو کے مہمان کی حیثیت سے ہم سے رعایت کے ساتھ وصول کیا جاتا ہے) کھانا ہم ہوٹل میں کم ہی کھاتے ہیں۔ کیونکہ ہمیں اپنی بھوک اتنی پیاری نہیں جتنی کہ عزت ہے۔ اور باتیں بعد میں ہوں گی، پچھلے

مسز آسانو کا حال سنئے ۔ جو ایشیائی ثقافتی مرکز کے بک ڈویژن کی چیف ہیں، اور جو ہمارے خیر مقدم کیلئے بہ نفس نفیس تشریف لے آئی تھیں ۔ مسز آسانو سچ مچ جہاندیدہ خاتون ہیں ۔ ساری دنیا گھوم چکی ہیں ۔ ہندوستان بھی کئی بار تشریف لا چکی ہیں ۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان کے بارے میں ہم سے زیادہ جانتی ہیں ۔ انہوں نے ہی ہمیں ہندوستان کے بارے میں یہ بتایا کہ ہندوستان میں چیزیں بہت سستی ہیں ۔ (ہمیں یہ بات جاپان جانے تک معلوم نہیں تھی، آپ میں سے بہتوں کو اب بھی معلوم نہیں ہوگی) مسز آسانو نے پہلے پہل ہمیں بتایا کہ ہندوستانی بڑے مہذب شائستہ اور ایماندار ہوتے ہیں ۔ اگر خدانخواستہ مسز آسانو سے ملاقات نہ ہوتی تو ہمیں اپنے وطن عزیز کے بارے میں اتنی اہم معلومات کہاں سے حاصل ہوتیں ۔ ہم ۱۲ گھنٹوں کے ہوائی سفر کے بعد ٹوکیو پہونچے تھے اور یہ ہماری خوش نصیبی تھی کہ مسز آسانو ہمارے استقبال کیلئے آئی تھیں ۔ ہوٹل میں ہمارا سامان رکھوانے کے بعد بولیں "آج رات کا کھانا آپ ہمارے ساتھ کھائیں گے" اس وقت رات کے ۸ بجے تھے ۔ ہم نے کہا" مسز آسانو مانا کہ ٹوکیو میں اس وقت رات کے آٹھ بجے ہیں مگر وطن عزیز میں اس وقت شام کے ۵ بجے ہوں گے ۔ یہ وقت تو ہمارے چائے پینے کا ہے ۔ یوں بھی طیارے میں ہم خوب ڈٹ کر کھا چکے ہیں ۔ اب کھانے کی حاجت نہیں ہے ۔"

بولیں "ٹوکیو میں آپ کی پہلی شام میرے ساتھ گزرے گی۔ چاہے آپ چائے پئیں یا ڈنر کھائیں" ۔

ہم نے مذاق میں کہا "مسز آسانو کیا آپ کو پتہ ہے کہ اردو میں آپ کے نام کے کیا معنی ہوتے ہیں؟"

ہنس کر بولیں "مجھے پتہ ہے کہ میرا نام آسانو ہے، اور آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں ہر مشکل آسان کر دیتی ہوں"

ہم نے حیرت سے کہا "سچ سچ بتائیے آپ کو اپنے نام کے یہ اردو معنی کس نے بتائے تھے"

اپنے چہرے پر اچانک سنجیدگی طاری کر کے بولیں۔ آپ ہی کی زبان کے ایک پاکستانی ادیب ہوا کرتے تھے جو ہمارے ایشیائی ثقافتی مرکز کے سیمناروں میں شرکت کیلئے آیا کرتے تھے۔ کئی بار وہ ٹوکیو آئے۔ بڑے زندہ دل آدمی تھے۔ نام ان کا ابن انشاء تھا آپ نے انہیں ضرور پڑھا ہوگا" ۔

ہم نے کہا "مسز آسانو! ابن انشاء ہمارے محبوب اور پسندیدہ ادیب رہ چکے ہیں ملاقات ان سے کبھی نہیں ہوئی۔ ہمارے بڑے بھائی ابراہیم جلیس کے جگری دوست تھے۔ اتنے جگری دوست تھے کہ دونوں دو تین مہینوں کے وقفہ سے آگے پیچھے اس دنیا سے رخصت ہو گئے" ۔

بولیں "بڑے زندہ دل آدمی تھے، میں تو سمجھتی تھی کہ انہوں نے صرف مذاق

میں اور مصلحتاً میرے نام کے یہ اردو معنی تراش رکھے تھے۔ اب آپ نے بھی میرے نام کے یہی معنی بتائے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابن انشاء نے میرے نام کا کوئی مزاحیہ ترجمہ نہیں کیا تھا۔ پھر آپ کا بھی کیا بھروسہ، آپ بھی تو مزاح نگار ہیں"۔

ہم نے حیرت سے کہا "مسز آسانو! آپ کو کس نے بتایا کہ ہم مزاح نگار ہیں"

بولیں "آپ ہی نے تو اپنے BIO - DATA میں سب کچھ لکھا ہے۔ میں آپ کے بارے میں سب کچھ جانتی ہوں کہ آپ سور کا گوشت نہیں کھاتے آپ کی تاریخ پیدائش بھی مجھے زبانی یاد ہے" ہم مسز آسانو کی عام معلومات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ فوراً ان کے ساتھ ڈنر کھانے کیلئے چلے گئے۔

وہ بولیں "آج رات آپ کو جاپانی ریستوراں میں نہیں ایک چینی ریستوراں میں لے جاؤں گی۔ ابھی تو آپ آئے ہیں۔ آتے ہی آپ کے جوتے کھلوانا نہیں چاہتی۔ جاپانی ریستورانوں میں نیچے بیٹھنے کا رواج ہوتا ہے۔ جن لوگوں نے حیدرآباد کے چوکی ڈنروں میں حصہ لیا ہے وہ اپنے تئیں یہ سمجھیں کہ وہ جاپانی ریستوران میں کھانا کھا چکے ہیں۔ مینو البتہ مختلف ہوتا ہے۔ ہم ٹوکیو کے جس علاقہ میں ٹھہرے ہیں اسے سوئیدو باشی کہتے ہیں۔ باشی جاپانی میں پل کو کہتے ہیں اور سارے جاپان میں آپ کو کئی باشی مل جائیں گے۔ ایک علاقہ کا نام توشا باشی سے ملتا جلتا ہے۔ ٹوکیو کا پہلا کھانا ہم نے ایک چینی ریستوران میں

کھایا۔

مسز آسانو نے پہلے تو ہمارے لئے سنگترے کا رس منگوایا۔ دہلی میں قیام کے بعد سے ہماری عادت یہ ہوگئی ہے کہ جب بھی سنگترے کا رس سامنے پیش کیا جاتا ہے تو اس میں کالی مرچ اور نمک ضرور ملالیتے ہیں۔ جیسے ہی ہم نے سنگترے کے رس میں کالی مرچ اور نمک ملانا شروع کیا تو مسز آسانو نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا" حسین صاحب عجیب اتفاق ہے کہ ابن انشاء بھی سنگترے کے رس میں کالی مرچ اور نمک ملایا کرتے تھے۔ کیا اردو میں مزاح نگاری کرنے کیلئے سنگترے کے رس میں کالی مرچ اور نمک ملانا ضروری ہوتا ہے"۔

ہم نے کہا" مسز آسانو! کہاں ابن انشاء اور کہاں ہم! ہم میں اور ان میں ایک قدر مشترک یہی ہے کہ ان کی طرح ہم بھی سنگترے کے رس میں کالی مرچ اور نمک ملایا کرتے ہیں۔ اس کے سوائے ہمیں کچھ نہیں آتا۔ ہم صرف رس میں نمک ملاتے ہیں۔ ابن انشاء اپنی تحریروں میں جتنا نمک مرچ ملاتے تھے وہ گر ہمیں نہیں آتا"۔

مسز آسانو پھر یادوں میں کھوگئیں اور بولیں" شاید آپ کو پتہ نہیں ابن انشاء پہلے پہل ٹوکیو میں ہی بیمار ہوئے تھے۔ یہیں ان کا میڈیکل چک اپ ہوا تھا۔ پھر وہ یہاں سے گئے تو ایسے گئے کہ کبھی نہیں آئے"۔

مسز آسانو کی اس بات سے ہم اس قدر خوف زدہ ہوئے کہ ٹوکیو میں جب

بھی ہمارے سامنے سنگترے کا رس آیا تو اس میں کبھی نمک نہیں ملایا۔

مسز اسانو نے اس رات دنیا جہاں کی باتیں کیں۔ کئی ہندوستانی دوستوں کا ذکر کیا۔ کھانے کا بل آیا تو ہم نے دیکھا کہ مسز آسانو نے بڑی آسانی کیساتھ ہنستے کھیلتے چار ہزار ین کی رقم ادا کردی اور ہمیں آٹے دال کے بھاؤ سے آگاہ کردیا۔

ہم ڈنر کھا کر ہوٹل پر واپس ہوئے تو دس بج رہے تھے۔ دوسرے دن پبلیشنگ کا کورس اور سیمینار شروع ہونے والا تھا۔ مسز آسانو نے وعدہ کیا کہ وہ سیمینار میں ہمیں لیجانے کیلئے صبح آجائیں گی۔ اسی وقت ہماری ملاقات تھائی لینڈ کی نمائندہ مس پرینیا سے ہوئی جو اسی شام تھائی لینڈ سے پہنچی تھیں۔ ہم دس بجے اپنے کمرے میں پہنچے تو افسوس ہوا کہ اے کاش ہماری اہلیہ محترمہ آج یہاں موجود ہوتیں۔ وہ دس بجے ہمیں اپنے کمرے میں دیکھکر کتنا خوش ہوتیں اس کا اندازہ کچھ ہم ہی لگا سکتے ہیں۔ کچھ دیر ٹیلی ویژن سے دل بہلاتے رہے۔ تاہم آدھے گھنٹے سے زیادہ جی نہیں بہلا سکے۔ کیونکہ سارے پروگرام جاپانی میں ہو رہے تھے۔ ہم نے سوچا کہ جب ساری زندگی رات دیر گئے لوٹنے میں گزار دی ہے تو ٹوکیو میں اس شریفانہ وضعداری سے کیوں انحراف کیا جائے۔ اس خیال کے آتے ہی ہم اپنے کمرے سے باہر نکلے تو دیکھا کہ مس پرینیا اپنے کمرے کے باہر کھڑی ہیں۔ پوچھا "خیریت تو ہے"

بولیں" تھائی لینڈ میں اس وقت آٹھ بجے ہوں گے اور مجھے اتنی جلدی سونے کی عادت نہیں ہے بس بور ہوئی جارہی ہوں"

ہم نے کہا" آپ کے ہاں تو آٹھ بجے ہوں گے ہمارے ہاں تو ابھی سات ہی بج رہے ہیں۔ یوں بھی ہم شب بیدار قسم کے آدمی ہیں۔ لہذا ٹوکیو کی سڑکیں ناپنے باہر جارہے ہیں"۔

بولیں" آپ اجازت دیں تو میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں" ہم دونوں ٹوکیو گرین ہوٹل سے باہر نکل آئے۔ طے کیا کہ سڑکوں کی نشانیاں ذہن میں محفوظ کر کے چلتے ہیں تاکہ واپسی میں آسانی ہو۔ ہوٹل کے کاونٹر سے ٹوکیو گرین ہوٹل کا کارڈ بھی اپنی جیب میں رکھ لیا۔ پہلے ایک ٹیلی فون بوتھ کی نشانی ذہن میں محفوظ رکھی کہ اس کے برابر والی گلی میں مڑنا ہے۔ بیس قدم کے بعد ایک اور بوتھ ملا جاپان میں ہر سڑک پر قدم قدم پر آپ کو ٹیلی فون بوتھ ملیں گے۔

ٹوکیو اس اعتبار سے خالص ایشیائی شہر نظر آیا کہ یہ ساری رات جاگتا ہے تقریباً ساری رات ہوٹلیں کھلی رہتی ہیں (حیدرآباد والے پتھر گٹی کو اپنے ذہن میں رکھیں۔) سڑکوں پر ٹریفک برابر جاری رہتا ہے۔ ہم بڑی دیر تک ٹوکیو کی سڑکوں پر گھومتے رہے۔ دو گھنٹوں بعد واپس ہوئے تو ہم سچ مچ تھک چکے تھے۔ جب ہم اپنے کمرے کی طرف جانے لگے تو مس پرینیا نے انگریزی آداب کے مطابق ہم سے کہا" آج رات کوئی اچھا سا خواب دیکھئے۔"

ہم نے کہا "مس پرینیا کیا کریں کمرہ اتنا چھوٹا ہے کہ اس میں کسی خواب کے داخل ہونے کی گنجائش ہی نہیں ہے"

مس پرینیا نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ بعد میں انہوں نے ہمارے اس جملے کو سمینار کے شرکاء میں اس قدر مقبول کیا کہ بالآخر اس کی اطلاع ہوٹل کے مینجمینٹ تک پہونچ گئی اور مینجمینٹ کے ایک فرد نے ہم سے ازراہ مذاق یہاں تک کہا کہ اگر آپ کو خواب دیکھنے کیلئے بڑے کمرے کی ضرورت ہے تو وہ آپ کو مل جائے گا۔ دس ہزار ین کرایہ دینا ہوگا۔

پروفیسر سوزوکی

اردو

اور مسز سوزوکی

جاپان میں سوزوکی بہت ہوتے ہیں۔ ٹوکیو میں پہلی بار ہم جس ٹیکسی میں بیٹھے تھے اس کے ڈرائیور کا نام بھی سوزوکی تھا۔ وہ جو موٹر چلا رہا تھا۔ خود اس کا نام بھی سوزوکی ہی تھا۔ ان کی ایک موٹر سائیکل کا نام بھی سوزوکی ہے ان دنوں جاپان کے جو وزیر اعظم ہیں وہ بھی سوزوکی ہی کہلاتے ہیں۔ جاپان کی یونیورسٹی برائے خواتین میں جب ہمارا خیر مقدم ہوا تو ہماری دیکھ بھال اور ہماری انگریزی کا جاپانی میں ترجمہ کرنے کے لئے جو خاتون مقرر ہوئیں وہ بھی اتفاقاً مسز سوزوکی ہی تھیں۔ بہت بھلی خاتون ہیں۔ ہندوستان بھی آچکی ہیں۔ ان کا ذکر ہم بعد میں تفصیل سے کریں گے۔ بہر حال جاپان میں قدم قدم پر آپ کو سوزوکی ملیں گے۔ اور یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ زندگی میں جس پہلے جاپانی دوست سے ہماری ملاقات ہوئی تھی وہ بھی سوزوکی ہی تھے۔ ہماری مراد ہے پروفیسر سوزوکی سے جو ٹوکیو یونیورسٹی برائے بیرونی مطالعات میں اردو کے پروفیسر اور صدر شعبہ ہیں۔

۱۹۷۳ء میں ان سے ہماری ملاقات دہلی کے جن پتھ ہوٹل میں ہوئی تھی ہمارے دوست اور کرم فرما حسن الدین احمد بھی اس رات موجود تھے۔

پروفیسر سوزوکی اپنے مقالے کی ریسرچ کے سلسلے میں کچھ دنوں کیلئے ہندوستان آئے تھے اور انہوں نے ہمیں رات کے کھانے پر بلایا تھا۔ہم اور حسن الدین احمد جب ان سے ملنے کے لئے جن پتھ ہوٹل پہونچے تو ہندوستان کی روایت کے مطابق اچانک بجلی فیل ہوگئی۔ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ پروفیسر سوزوکی نے ہم سے مصافحہ کرتے ہوئے ٹھیٹ جاپانی لہجے میں میر کا یہ شعر سنایا تھا۔۔

وہ آئے بزم میں اتنا تو میر نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

ہم اس وقت تک جاپان نہیں گئے تھے بلکہ کسی جاپانی سے کبھی ملاقات ہی نہیں کی تھی۔ایک جاپانی کے منہ سے میر کا شعر سن کر ہمارے دل ودماغ میں روشنی تو ضرور پیدا ہوئی تھی۔ لیکن دل ودماغ کی روشنی سے کسی کا چہرہ تو نہیں دیکھا جاسکتا۔ دہلی میں معمول ہے کہ جب بجلی چلی جاتی ہے تو بس چلی ہی جاتی ہے۔ جلد واپس آنے کا نام نہیں لیتی۔ پروفیسر سوزوکی کے ساتھ ہماری وہ رات اندھیرے میں ہی گزری تھی۔۔نہ انہوں نے ہمیں جی بھر کے دیکھا اور نہ ہم نے انھیں۔ جن پتھ ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں ہم نے موم بتیوں کی روشنی میں رات کا کھانا کھایا تھا۔ پروفیسر سوزوکی نے کھانے سے پہلے کچھ مشروبات کا آرڈر دیتے ہوئے کہا تھا۔ "آج کی رات کھانے سے پہلے کوئی نہ کوئی

شربت پینا ضروری ہے۔ کیونکہ ایک شربت جسے اردو والے زیادہ پیتے ہیں وہ آج ہم پی نہیں سکتے"۔

ہم نے پوچھا تھا" پروفیسر سوزوکی! آپ کا اشارہ کس شربت کی طرف ہے؟" ہنس کر بولے" میری مراد شربت دیدار سے ہے۔ بجلی کو فیل ہوئے دو گھنٹے ہو چکے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ آج رات نہ ہم آپ کو دیکھ سکیں گے اور نہ آپ ہمیں"

پروفیسر سوزوکی کو دوسرے دن صبح کے طیارے سے حیدرآباد جانا تھا۔ وہاں کچھ دن رک کر گلبرگہ جانا تھا، ہم نے پروفیسر سوزوکی سے کہا تھا" پروفیسر سوزوکی! آپ اس جگہ جارہے ہیں، جہاں کے ہم نکالے ہوئے ہیں۔ حیدرآباد میں زندگی کے بیس برس گزارے اور گلبرگہ تو ہماری جائے پیدائش ہے۔ وہاں بھی اپنی زندگی کا خاصا وقت برباد کر چکے ہیں۔ ہم نے اندھیرے میں انہیں جناب عابد علی خان ایڈیٹر" سیاست" اور بزرگ دوست سلیمان خطیب کے پتے دیئے تھے کہ ان مقامات پر جائیے تو ان حضرات سے ضرور ملئیے۔ آپ کی ریسرچ ٹھکانے لگ جائے گی۔ بہر حال ۱۹۷۳ء میں پروفیسر سوزوکی نے ہمیں اپنا وزیٹنگ کارڈ دیتے ہوئے کہا تھا" مجھے افسوس ہے کہ آپ کا دیدار نہیں کر سکا پھر بھی میرا وزیٹنگ کارڈ اپنے پاس رکھئے۔ کم از کم آپ سے خط وکتابت تو ہوتی رہے گی اور کیا عجب کہ کبھی آپ جاپان بھی آجائیں" ہمیں کیا پتہ تھا کہ پروفیسر سوزوکی اس وقت صرف ایک رسمی خواہش کا اظہار نہیں کر رہے تھے

بلکہ ہمارے حق میں دعا فرما رہے تھے ۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ان کی دعا پورے سات سال بعد قبول ہو جائے گی ۔ اور ہم یوں اچانک جاپان چلے جائیں گے ۔ ہم نے رسماً ان سے وزیٹنگ کارڈ لے لیا تھا اور اپنا وزیٹنگ کارڈ اس لئے نہیں دیا تھا کہ ہمارا کوئی وزیٹنگ کارڈ ہی نہیں تھا ۔ زندگی میں ایک بار ہم نے اپنے وزیٹنگ کارڈ چھپوائے تھے اور انہیں لوگوں میں تقسیم بھی کئے تھے ۔ اس کے بعد ہمیں احساس ہوا تھا کہ بعض لوگ " وزیٹنگ کارڈ " کو خوامخواہ سنجیدہ لے لیتے ہیں ۔ ان وزیٹنگ کارڈوں کے حوالے سے ہمارے تعلقات کا حلقہ خوامخواہ وسیع ہونے لگا تھا ۔ یوں بھی ہمارا دائرہ احباب کچھ کم وسیع نہیں ہے کہ ہم اسے اور وسیع کرتے لہذا بعد میں وزیٹنگ کارڈ کے کھڑاگ میں نہیں پڑے ۔ ہمارا اصول یہ ہے کہ نئے لوگوں سے ضرور ملو لیکن انہیں اپنے گھر کا پتہ نہ بتاو ۔ اس سے زندگی بڑی پر سکون رہتی ہے ۔ مگر پروفیسر سوزوکی چونکہ بیرونی باشندے تھے اور اس پر مستزاد یہ کہ جاپان میں اردو کی خدمت کر رہے تھے ۔ اسی لئے ہم نے ہندوستانی روایت کے مطابق سگریٹ کی ڈبیہ کے ایک ٹکڑے پر اپنا نام اور پتہ لکھ کر دے دیا تھا کہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آوے ۔

پروفیسر سوزوکی دوسرے دن حیدرآباد چلے گئے ۔ بعد میں " سیاست " میں ان کا ایک انٹرویو بھی نظر سے گزرا ۔ گلبرگہ سے سلیمان خطیب کا خط بھی آیا

کہ جاپان کے پروفیسر سوزوکی گلبرگہ آئے تھے۔ہم سے زیادہ اردو جانتے ہیں اور صوفیائے کرام کی تعلیمات کے بارے میں بھی ہم سے زیادہ معلومات رکھتے ہیں۔(اس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے)

پروفیسر سوزوکی ان دنوں ہندوستان کے صوفیائے کرام کی اردو خدمات پر ریسرچ کرنے کیلئے آئے تھے۔ بات آئی گئی ہوگئی مگر پروفیسر سوزوکی کی سچائی کے ہم اس وقت قائل ہوگئے جب انہوں نے جاپان جاکر چار مینار سگریٹ کی ڈبیہ پر لکھے ہوئے ہمارے پتے پر شکریہ کا ایک خط لکھا۔(جاپانی بہت سنجیدگی کے ساتھ شکریہ ادا کرتے ہیں ہم نے جاپان جاکر دیکھا کہ بیچارے جاپانیوں کی زندگی کا بڑا حصہ صرف شکریہ ادا کرنے میں گزر جاتا ہے اس کے بارے میں کبھی الگ سے لکھیں گے۔ شکریہ)ہم نے آپ کا شکریہ جو سراسر بے موقع ہے محض اس لئے ادا کیا ہے کہ جاپان آنے کے بعد سے ہمیں بھی شکریہ ادا کرنے کی عادت سی ہوگئی ہے۔ شکریہ

یہ ایک حقیقت ہے کہ جب ہم جاپان جانے لگے تو ہمارے ذہن میں صرف دو شخصیتیں تھیں۔ ایک شخصیت پروفیسر سوزوکی کی اور دوسری شخصیت مسز اندو جین کی۔ مسز اندو جین ہندی کی مشہور شاعرہ ہیں اور دہلی ٹیلی ویژن سے بھی وابستہ رہ چکی ہیں۔ دہلی میں ہمارے قیام کے بعد سے ان سے ہماری یاد اللہ ہے۔پچھلے دو برسوں سے وہ ٹوکیو یونیورسٹی میں جاپانیوں کو

ہندی پڑھا رہی ہیں ۔ ان کا پتہ ہمارے پاس تھا مگر پروفیسر سوزوکی کے پتے کی فکر تھی ۔ ہمیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ پروفیسر سوزوکی آیا اب بھی صوفیائے کرام کی تعلیمات پر ریسرچ کر رہے ہیں یا خود صوفی بن گئے ہیں ۔ ان کی دعا کی قبولیت کے بعد ہمیں موخر الذکر امکان زیادہ قوی نظر آنے لگا تھا خیر ہم نے ٹھان لیا تھا کہ تجھے ڈھونڈ ہی لیں گے کہیں نہ کہیں ۔ لہذا ٹوکیو پہونچتے ہی پہلی ہی رات کو ہم نے مسز آسانو سے کہ موصوفہ ہر مشکل آسان کر دیتی ہیں پروفیسر سوزوکی تاکیشی کا ذکر کیا اور کہا ہندوستان میں ہم چونکہ انہیں دیکھ نہیں سکے تھے اب جاپان آئے ہیں تو لگے ہاتھوں دیکھ لینا چاہتے ہیں ۔ بولیں میں پروفیسر سوزوکی کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں ۔ ٹوکیو یونیورسٹی برائے بیرونی مطالعات میں اردو کے صدر شعبہ ہیں ۔ ابن انشاء بھی ٹوکیو آتے تھے تو سب سے پہلے پروفیسر سوزوکی تاکیشی سے ہی ربط پیدا کرتے تھے ۔

چنانچہ مسز آسانو نے دوسرے ہی دن فون پر پروفیسر سوزوکی سے ہمارا رابطہ قائم کروا دیا ۔ پروفیسر سوزوکی کی یادداشت کے ہم اس وقت قائل ہو گئے جب ہم نے اپنا نام بتایا تو دوسری طرف سے بولے "ارے مجتبیٰ صاحب! آپ جن پتھ ہوٹل کے اندھیرے میں سے اٹھ کر ٹوکیو کی روشنیوں میں کدھر آ نکلے ۔ مجھے وہ رات اب تک یاد ہے ۔ آپ سے جلد از جلد کب ملاقات ہو سکتی ہے تاکہ میں شربت دیدار پی سکوں ۔"

ہم نے کہا" آج ٹوکیو میں ہمارا پہلا دن ہے ۔ یونیسکو کے سیمنار میں آئے ہیں ۔ ہمیں کچھ پتہ نہیں کہ ہم کہاں ہیں اور آپ کہاں ہیں ۔ ذرا سنبھل جائیں اور یونیسکو کا پروگرام معلوم ہو تو فون پر ملاقات کا وقت طے کر لیں گے ۔"

وہ بولے " ٹوکیو یونیورسٹی میں ہم آپ کا خیر مقدم کرنا چاہتے ہیں ۔ پورا ایک دن ہمارے لئے خالی رکھئے " ہم نے انھیں ہوٹل کا پتہ اور فون نمبر دے دیا اور جوابا ان کا فون نمبر اور پتہ لے لیا ۔ بعد میں مسز آسانو نے بتایا کہ " پروفیسر سوزوکی کا گھر ٹوکیو کے مضافات میں واقع ہے ۔ یونیورسٹی اگر چہ بہت قریب یعنی ۳۰ کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے ۔ مگر یہ دن کے وقت کھلی رہتی ہے اور آپ کا سمینار بھی اسی وقت چلتا ہے لہذا آٹھ دس دن تک پروفیسر سوزوکی سے ملاقات کا کوئی امکان نہیں " مایوس ہو کر ہم نے فون کا سہارا لیا ۔ بعد میں تقریبا ہر روز پروفیسر سوزوکی فون پر ہم سے اردو بولتے تھے اور ہم ان سے ۔

ٹوکیو میں ہمارے قیام کو ابھی تین دن ہی ہوئے تھے کہ ایک رات دیر سے ہوٹل پہنچے تو پیغام ملا کہ کوئی صاحب ہیروشی ہاگیتا تھے جو ہم سے ملنے آئے تھے اور ہم سے ملاقات نہ ہونے پر سلیس اردو میں اظہار افسوس بھی کیا تھا گویا بہت ہی اظہار افسوس کیا تھا ۔ متاثر کن بات یہ دکھائی دی کہ انہوں نے ہمارا نام بالکل صحیح لکھا تھا ۔ خود اردو جاننے والے ہمارا نام صحیح نہیں لکھ سکتے ۔ ایک جاپانی سے یہ توقع نہ تھی ۔

دوسرے دن ہم نے پروفیسر سوزوکی کو فون کیا کہ کوئی صاحب ہیروشی ہاگیتا ہم سے ملنے آئے تھے ہم تو انہیں نہیں جانتے۔ پروفیسر سوزوکی بولے میں انہیں جانتا ہوں۔ وہ میرے طالب علم ہیں۔ اردو میں ایم اے کر رہے ہیں۔ کل رات میں اپنے طلباء کے ساتھ آپ کے ہوٹل پر آیا تھا مگر آپ غائب تھے۔

ٹوکیو یونیورسٹی میں ہمارا خیر مقدم بارہ دن بعد ہوا مگر اس وقت تک جاپانی ٹیلیفون پر خوب اردو بولی گئی بلکہ گھنٹوں بولی گئی اور ایک دن اسی ٹیلیفونی اردو کے باعث ہم ایک مشکل صورت حال سے دوچار ہوگئے۔ اور بے حد شرمندہ ہوئے۔

ہم نے مضمون کے آغاز میں سوزوکیوں کی کثرت کے پس منظر میں مسز سوزوکی کا ذکر کیا ہے جن سے ہماری ملاقات جاپان کی یونیورسٹی برائے خواتین میں ہوئی تھی بات دراصل یہ ہوئی کہ ٹوکیو پہنچنے کے چار پانچ دن بعد ہی جاپان کی زنانہ یونیورسٹی میں ہمارا خیر مقدم طے ہوگیا۔ (ہمیں کیا پتہ تھا کہ جاپانی خواتین کو ہمارا خیر مقدم کرنے کی جلدی ہے) اس خیر مقدم کی تفصیل بعد میں لکھیں گے۔ اس وقت اتنا سن لیجئے کہ زنانہ یونیورسٹی میں ہماری انگریزی کا جاپانی ترجمہ کرنے کی ذمہ داری مسز سوزوکی کی تھی جو اسی یونیورسٹی میں پڑھاتی ہیں۔ بہت مخلص خاتون ہیں۔ زنانہ یونیورسٹی میں ہم چھ گھنٹوں تک

رہے ۔لنچ بھی لڑکیوں کے جھرمٹ میں کھایا۔ مسز سوزوکی نے ہمیں اپنا پتہ اور ٹیلیفون نمبر دیا اور خواہش کی کہ ہم جلدی ہی فون کر کے ان سے ملاقات کا وقت طئے کر لیں ۔ جاپان میں ہمارا معمول یہ ہے کہ ہم اردو بولنے کی چاٹ میں صبح اٹھکر پہلے پروفیسر سوزوکی کو فون کرتے ہیں ۔ لہذا دوسرے دن علی الصبح ہم نے پروفیسر سوزوکی کو فون کرنے کی غرض سے غلط فہمی میں مسز سوزوکی کا فون نمبر ملا لیا ۔ دوسری طرف سے ایک خاتون کی آواز آئی تو ہم نے انگریزی میں پوچھا "آپ کون بول رہی ہیں؟" دوسری طرف سے انگریزی میں جواب آیا" میں مسز سوزوکی بول رہی ہوں" ہم نے اپنا تعارف کرایا تو بیحد خوش ہوئیں ۔ بولیں" میں آپ کے فون کا انتظار ہی کر رہی تھی" ہم تھوڑی دیر کے لئے حیران رہ گئے کہ پروفیسر سوزوکی کی بیوی کو ہمارے فون کا انتظار کیوں تھا ۔ پھر سوچا غالبا پروفیسر سوزوکی نے اپنی بیگم صاحبہ کو ہماری آمد کے بارے میں بتایا ہوگا بات چیت جاری رہی ۔ مسز سوزوکی نے پہلے تو ہمارا حال پوچھا ۔ طبیعت کے بارے میں استفسار فرمایا ۔ یہ بھی پوچھا کہ رات آپ کو نیند برابر آئی یا نہیں ۔ کوئی تکلیف ہو تو بتائیے میں اسے دور کئے دیتی ہوں ۔ اور پھر یہ بتائیے کہ آپ کی ہماری ملاقات کب ہوگی"

آپ جانتے ہیں کہ ہم بڑے شریف آدمی ہیں ۔ دوستوں کی بیویوں سے زیادہ باتیں نہیں کرتے ۔ جب ہماری ذات میں مسز سوزوکی کی دلچسپی بڑھنے لگی

توہم نے راست انداز میں کہا" مسز سوزوکی آپ سے ملاقات تو ضرور ہوگی ۔ لیکن ذرا پہلے اپنے شوہر سے ہماری بات کروائیے ۔یوں بھی ہم اردو بولنے کے لئے بے حد بے چین ہیں"

مسز سوزوکی ذرا پریشان ہو کر قدرے توقف کے بعد بولیں" میرے شوہر! میرے شوہر سے آپ بات کر کے کیا کریں گے؟"

ہم نے کہا" ایک ضروری بات کرنی ہے پھر اردو بھی بولنی ہے"

مسز سوزوکی بولیں" مگر وہ تو اردو نہیں جانتے"

ہم نے کہا" مسز سوزوکی! اب مذاق چھوڑیئے آپ اپنے شوہر کو نہیں جانتیں"

مسز سوزوکی بولیں" میں مذاق نہیں کر رہی ہوں ۔سچ کہہ رہی ہوں ۔ وہ اردو نہیں جانتے بلکہ وہ آپ کو بھی نہیں جانتے"

ہم نے کہا" کیا بات کرتی ہیں آپ بھی ۔ان سے ہندوستان میں ہماری ملاقات ہو چکی ہے ۔ٹوکیو آنے کے بعد ہم روزانہ سے فون پر بات کرتے ہیں"۔

مسز سوزوکی بولیں" اگر یہ بات تھی تو کل جب زنانہ یونیورسٹی میں آپ سے ہماری ملاقات ہوئی تھی تو آپ نے اس راز کو کیوں پوشیدہ رکھا۔ ذرا رکئیے میں اپنے شوہر کو ابھی بلاتی ہوں" اپنے شوہر کو بلانے کے لئے جب فون کا ریسیور انہوں نے رکھا تو اچانک ہمیں احساس ہوا کہ یہ وہ مسز سوزوکی ہیں جن سے کل زنانہ یونیورسٹی میں ہماری ملاقات ہوئی تھی ۔سوزوکیوں کی بہتات میں ہم نے

فون کا غلط نمبر ملا لیا تھا اور بیچاری مسز سوزوکی کو پریشان کر رہے تھے۔ مگر اب کیا کیا جا سکتا تھا۔ چارو ناچار فون کا ریسیور پکڑے رہے۔ دو منٹ کے وقفے کے بعد پھر فون پر مسز سوزوکی آئیں انہوں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا" مسٹر حسین! اس وقت تو میرے شوہر باہر گئے ہوئے ہیں۔ مگر قبل اس کے کہ آپ میرے شوہر سے بات کریں میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں"۔

ہم نے حد سے زیادہ ندامت کے لہجے میں کہا" مسز سوزوکی! ہمیں معاف کر دیجئیے ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کے شوہر سے کبھی بات نہیں کریں گے۔ اصل میں ہمیں غلط فہمی ہو گئی ہے۔ ہم ٹوکیو یونیورسٹی کے پروفیسر سوزوکی کو فون ملانا چاہتے تھے مگر غلطی سے آپ کا نمبر ملا بیٹھے۔ ڈائری میں مسٹر اور مسز کی طرف دھیان ہی نہیں گیا۔ مسافر ہیں۔ ٹوکیو میں نئے نئے آئے ہیں۔ سوزوکیوں کی کثرت سے پریشان ہو گئے ہیں۔ خدا کیلئے ہمیں معاف کر دیجئیے"

مسز سوزوکی نے فون پر اطمینان کا لمبا سانس لے کر پہلے تو زور دار قہقہہ لگایا پھر بولیں" چلئے اس غلط فہمی میں آپ سے بات تو ہو گئی مگر سچ تو یہ ہے کہ میں بہت پریشان تھی کہ آپ نہ جانے میرے شوہر سے کیا بات کرنا چاہتے ہیں؟"

فون کا ریسیور رکھ کر ہم اتنے نادم ہوئے کہ بڑی دیر تک اپنی پیشانی پر پسینے کے قطرے پونچھتے رہے۔ بعد میں پروفیسر سوزوکی کو اس حادثہ کی اطلاع

دی تو بہت خوش ہوئے۔ بولے "آپ کے حق میں یہ حادثہ ناخوشگوار ہوگا مگر میرے لئے تو خوشگوار ہے۔"

جاپان میں اردو

صاحبو! ان دنوں ہندوستان کے سوائے ہر جگہ اردو کی تلاش جاری ہے امریکہ میں اردو، برطانیہ میں اردو، خلیجی ممالک میں اردو، سنگاپور میں اردو، اور رنگون میں اردو، جیسے مضامین تو آپ نے پڑھے ہونگے۔ ابھی حال ہی میں ایک صاحب نے نائجیریا تک میں اردو کی تلاش کی ہے۔ ان حالات میں یہ ناممکن تھا کہ ہم جاپان جاتے اور وہاں اردو کو تلاش نہ کرتے۔ بلفضل تعالی جاپان میں تو اچھی خاصی اردو موجود ہے بلکہ اتنی اردو موجود ہے کہ ہمیں وہاں اردو کو تلاش کرنا نہیں پڑا بلکہ اردو نے خود ہمیں تلاش کر لیا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب جاپانی اردو کے کرتا دھرتاؤں کو پتہ چلا کہ ہم جاپان آئے ہوئے ہیں تو انہوں نے ہمارے ساتھ وہی سلوک کیا جو ایک اردو والا دوسرے اردو والے کے ساتھ کرتا ہے یعنی فوراً ہمارے خیر مقدمی جلسہ کا اہتمام ہوگیا۔ اس کے ذمہ دار ہمارے دوست سوزو کی تاکیشی تھے جو ٹوکیو یونیورسٹی برائے بیرونی مطالعات میں اردو کے پروفیسر اور صدر شعبہ ہیں اردو ماحول اور اردو تہذیب میں اس قدر ڈوبے ہوئے ہیں کہ انہیں دیکھ کر حسرت ہوتی ہے کہ اے کاش ہم بھی اردو کے لئے اتنا کچھ کر سکتے۔ ابھی حال میں انہوں نے اوساکا یونیورسٹی برائے بیرونی مطالعات کے اردو استاد پروفیسر اسادہ کے اشتراک سے ایک

جاپانی اردو لغت مرتب کی ہے - پروفیسر سوزوکی اپنی یونیورسٹی میں فوراً ہمارا
خیر مقدم کرنا چاہتے تھے لیکن آپ تو جانتے ہیں کہ اردو کے ہر اچھے اور سچے کام
میں رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں - سو جاپان میں بھی یہی ہوا - یونیسکو والوں نے
ہمارا پروگرام اتنا کسا ہوا بنایا تھا کہ جاپان پہنچنے کے تیرہ دن بعد بھی ہم اپنا خیر
مقدم نہ کروا سکے - عجیب بے چینی کا عالم تھا ہم نے یونیسکو والوں سے گڑگڑا کر کہا
کہ خدارا ہماری ایک دوپہر خالی رکھی جائے تاکہ ہم ٹوکیو یونیورسٹی میں اپنا خیر
مقدم کروا آئیں - یوں بھی آج تک کسی یونیورسٹی میں ہمارا خیر مقدم نہیں
ہوا ہے - اب جاپانیوں کی غفلت سے ایک موقع ہاتھ آیا ہے تو اس میں یونیسکو
اپنی ٹانگ اڑا رہا ہے - کہنے کو رہ جائے گا کہ کسی یونیورسٹی میں کبھی ہمارا بھی خیر
مقدم ہوا تھا ورنہ یونیورسٹیوں سے ہمارا کیا تعلق - جب یونیورسٹی میں پڑھتے
تھے تو تب یونیورسٹی سے بے تعلق اور بے نیاز سے رہتے تھے - ہماری لگاتار
عاجزیوں نے بالآخر یونیسکو کے عہدہ داروں کے دل میں ہمارے لئے رحم کا
جذبہ پیدا کر دیا اور ایک دن ہم سچ مچ اپنا خیر مقدم کروانے کیلئے ٹوکیو یونیورسٹی
کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے - پروفیسر سوزوکی نے کہہ رکھا تھا کہ ہم ٹھیک دو
بجے شعبہ اردو میں پہنچ جائیں - مگر اپنا خیر مقدم کروانے کی ہمیں کچھ اتنی جلدی
تھی کہ ڈیڑھ بجے ہی یونیورسٹی کے سینہ پر مونگ دلنے کیلئے جا پہنچے - تھوڑی دیر
کے لئے احساس بھی ہوا کہ جاپانی وقت کے پابند ہوتے ہیں - کوئی کام وقت

سے پہلے یا وقت کے بعد نہیں کرتے ۔ اگر ہم آدھا گھنٹہ پہلے بھی پہنچ گئے تو ہمارا خیر مقدم مقررہ وقت سے پہلے نہیں کریں گے ۔ بہر حال پروفیسر سوزوکی کے کمرے کے باہر ایک بورڈ پر فارسی رسم الخط میں لکھا تھا "خوش آمدید مجتبیٰ حسین" ہم کمرے کے اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ تین چار جاپانی لڑکیاں اپنے سامنے اردو کی کتابیں پھیلائے بیٹھی ہیں ۔ ہمیں دیکھتے ہی ان لڑکیوں نے کہا "السلام علیکم" ہم نے وعلیکم السلام کے بعد انگریزی میں پوچھا کہ پروفیسر سوزوکی کہاں ہیں تو ایک لڑکی نے نہایت سلیس اردو میں کہا "وہ تو دو بجے ہی یہاں آئیں گے کیوں کہ آپ کا استقبال تو دو بجے ہونا ہے پروفیسر سوزوکی ایم ۔ اے کی کلاس لینے گئے ہیں" ہم پر دو باتوں کی وجہ سے گھڑوں پانی پڑ گیا اول تو وقت سے پہلے پہنچنے پر اور دوسرے یہ کہ جب جاپانی لڑکیاں اردو بول رہی ہیں تو ہم نے کیوں خواہ مخواہ اپنی انگریزی دانی کا مظاہرہ کیا ۔ ہم نے ان لڑکیوں سے پوچھا "آپ اردو پڑھتی ہیں" ایک طالبہ مسز شاشورے نے بتایا وہ ٹوکیو یونیورسٹی سے اردو میں ایم ۔ اے کر رہی ہیں اور ماشاءاللہ عصمت چغتائی کی افسانہ نگاری پر مقالہ لکھ رہی ہیں ۔ عصمت چغتائی کی ساری کتابیں موصوفہ کے سامنے تھیں ۔ بعض کتابیں ایسی بھی تھیں جن کا دیدار خود ہم نے کبھی نہیں کیا تھا ۔ ایک اور بی بی تاکاماشے کے سامنے کرشن چندر کی کتابیں "شکست" "پودے" اور "جب کھیت جاگے" رکھی تھیں ہم خط کا مضمون لفافہ دیکھ کر بھانپ لیتے ہیں ۔ چنانچہ

ہم نے پوچھا" اور بی بی آپ غالباً کرشن چندر پر ریسرچ کر رہی ہیں" اثبات میں سر ہلا کر بولیں "کرشن چندر میرے پسندیدہ ادیب ہیں۔ کیا آپ کی کبھی کرشن چندر سے ملاقات ہو چکی ہے"

ہم نے ڈینگ مارنے کے انداز میں کہا" بی بی! اگر کرشن چندر آپ کے محبوب ادیب ہیں تو ہم نہ صرف کرشن چندر کے بلکہ عصمت چغتائی کے بھی محبوب ادیب رہ چکے ہیں"

ہماری بات کو سن کر دونوں طالبات کے منہ حیرت سے کھل گئے۔ بولیں "کیا سچ مچ آپ کرشن چندر اور عصمت چغتائی سے مل چکے ہیں۔ یہ تو بڑی عظیم ہستیاں ہیں۔"

بعد میں پانچ سات منٹ تک ہم نے ان طالبات کو اردو ادب میں اپنے صحیح مقام سے آگاہ کیا۔ اردو ادب کیلئے اپنی گرانقدر خدمات ان کے گوش گزار کیں۔ یہ بھی کہا کہ ہم بھی کچھ کم عظیم ہستی نہیں ہیں۔

مسز شاشورے بولیں" اگر آپ عصمت چغتائی کو سچ مچ جانتے ہیں تو میرا ایک کام کر دیجئیے۔ مجھے ان کی کتاب" دھانی بانکیں" نہیں مل رہی ہے۔ کیا آپ ان سے کہہ کر یہ کتاب میرے لئے بجھوا دیں گے"۔

ہم نے جھوٹ موٹ کہا" آپ اطمینان رکھیں ہندوستان جانے کے بعد ہم عصمت چغتائی کو اس سلسلہ میں بتائیں گے اور آپ کو یہ کتاب مل جائے گی"

مسز شاشورے نے پوچھا "آپ ہندوستان کے کس علاقہ سے تعلق رکھتے ہیں؟"

ہم نے کہا "بی بی! ویسے تو ہم ان دنوں دہلی میں رہتے ہیں لیکن اصل میں ہمارا تعلق حیدرآباد سے ہے۔ کبھی آپ نے نام سنا ہے"

بولیں "حیدرآباد تو میرا محبوب شہر ہے۔ میں وہاں جاچکی ہوں۔ چار مینار کا شہر۔ معصوم سیدھے سادے اور خوش اخلاق لوگوں کا شہر"۔

ہم نے کہا "اتنی کم عمری میں آپ کو حیدرآباد جانے کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟"

بولیں "جاپان کی یونیورسٹیاں اپنے طلباء کو اس علاقہ اور ماحول میں ضرور بھیجتی ہیں جس علاقہ اور ماحول کی یہ زبان سیکھ رہے ہوتے ہیں"۔

بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ ٹوکیو یونیورسٹی کے اردو پڑھنے والے سارے طلباء ہندوستان اور پاکستان کے کئی شہروں کا دورہ کرچکے ہیں۔

مسز شاشورے نے ہم سے پوچھا "کیا آپ کبھی حیدرآباد جاتے ہیں؟" ہم نے اثبات میں جواب دیا تو بولیں "اگلی بار آپ جب بھی حیدرآباد جائیں تو چارمینار کے مچھلی کمان والے اور لاڑ بازار کے برابر والے مینار پر میرا نام ضرور تلاش کریں میں نے اردو رسم الخط میں اپنا نام وہاں کھودا تھا۔"

ہم نے کہا "بی بی! حیدرآباد میں اپنی زندگی کے بیس برس گزارنے کے باوجود آج تک ہم کبھی چارمینار پر نہ جاسکے اب آپ کی خاطر جائیں گے۔ مگر یہ آپ کو اپنا نام وہاں لکھنے کی کیا سوجھی۔ اب ہم بھی جواباً اپنا نام آپ کے ٹوکیو ٹاور پر

اردو رسم الخط میں لکھ کر جائیں گے"۔

بولیں" جاپان میں آپ یہ نہ کر سکیں گے۔کیوں کہ ہمارے یہاں عمارتوں کو تصنیف و تالیف کے لئے استعمال نہیں کیا جاتا۔آپ کے ہاں یہ رواج ہے کہ جہاں کہیں کوئی تاریخی عمارت دیکھی اس پر اپنا نام لکھ دیا۔ میں نے بھی چار مینار پر اپنا نام محض اس لئے لکھا تھا کہ وہاں چار پانچ اصحاب پہلے ہی سے اپنے ناموں کو کندہ کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا کہ شاید آپ کے ہاں ایسا کرنے کا دستور ہے۔"

اس کا جواب مسز شاشورے کو ہم کیا دے سکتے تھے۔ لہذا خاموش ہو گئے تاہم حیدرآبادیوں سے ہماری گزارش ہے کہ اگر انہیں یہ نام چارمینار پر دکھائی دے تو ہمیں ضرور اطلاع کریں،ہم مسز شاشورے کو اس کی اطلاع دیدیں گے۔ بے چاری بہت بے چین ہیں۔آپ کے حق میں دعا کریں گی۔

اتنے میں کچھ اور طلبا وہاں آ گئے۔ ایک لڑکی کتابوں کا بوجھ لادے اچانک کمرے میں آئی اور اپنا تعارف کراتے ہوئے بولی" میں آیکوآدکی ہوں۔ مجھے افسوس ہے میں آج کی محفل میں نہ رہ سکوں گی۔ مجھے ایک ضروری کام ہے۔آپ سے معذرت کرنے آئی ہوں"۔

ہم نے پوچھا"آپ کونسی کلاس میں پڑھتی ہیں؟"

شرما کر بولیں"جی میں فارسی کی پروفیسر ہوں۔پڑھتی نہیں پڑھاتی ہوں"

جاپانیوں کی عمر کا اندازہ لگانا بہت دشوار ہوتا ہے ہم اپنی مترجم ساکورادا کے بارے میں یہ سمجھتے تھے کہ موصوفہ غیر شادی شدہ ہونگی۔ جب شناسائی بڑھی تو پہلے یہ پتہ چلا کہ دوسری جنگ عظیم میں ٹوکیو میں موجود تھیں۔ بعد میں ایک بار وہ ہمیں اپنے گھر لے گئیں تو دیکھا کہ گھر میں ان ہی کی عمر کی ان کی ایک بیٹی اور دو بیٹے موجود ہیں۔ جاپانی بہت عمر چور ہوتے ہیں اس لئے آدمی کو بہت محتاط رہنا چاہیئے۔

پروفیسر سوزوکی ٹھیک دو بجے کمرے میں آئے تو ان کے ساتھ مہمانوں کا ایک جم غفیر آگیا۔ ہندی کے پروفیسر تناکا اور ہندوستانی تاریخ کے پروفیسر مسٹر ناکامورا بھی آگئے۔ پروفیسر سوزوکی نے ٹوکیو میں اردو اور ہندی سے سروکار رکھنے والی ساری شخصیتوں کو جمع کرلیا تھا۔ ریڈیو جاپان کے ہندی شعبہ کے سربراہ مسٹر ناہارا بھی آگئے۔ اوساکا یونیورسٹی کے اردو استاد مسٹر اسادہ بھی موجود تھے۔ مسٹر ست پرکاش گاندھی بھی وہاں ملے جو ٹوکیو یونیورسٹی میں اردو کے استاد ہیں۔ پروفیسر سوزوکی کے چہیتے شاگرد ہیروشی ہاگیتا بھی ملے جو اردو ادب کو سکھوں کی دین پر ریسرچ کررہے ہیں۔ وہیں ایک صاحب مساو سوزوکی ملے جن کے بارے میں معلوم ہوا کہ ایک خانگی کمپنی سلک روڈ پبلیشنگ کمپنی میں ملازمین کو اردو پڑھاتے ہیں۔ غرض ہر طرف اردو بولنے والے موجود تھے۔ ہمیں بڑا سکون محسوس ہوا۔

پروفیسر تنا کا چونکہ ہندی کے پروفیسر ہیں اس لئے ہم نے ان سے پوچھا "آپ کے ہندی وبھاگ میں کتنے ودیارتھی شکشا پراپت کر رہے ہیں؟"۔

بولے "میرے شعبہ میں ۶۰ طلباء زیر تعلیم ہیں" ان کے منہ سے نہایت فارسی آمیز ہندی سن کر ہم بھونچکے رہ گئے۔ جاپان ریڈیو کے مسٹر اکی رانا ہارا سے ہم نے پوچھا "اور مہاشئے جی آپ کے ریڈیو سے ہندی پرسارن کس سمئے ہوتا ہے۔"

بولے "غالباً آپ جاپان ریڈیو کی ہندی نشریات کے نظام الاوقات کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں"۔ ہم نے کہا "جاپان ریڈیو کا نظام الاوقات تو ہم بعد میں جانتے رہیں گے۔ پہلے یہ بتائیے کہ آپ ہندی پروگرام کے انچارج ہیں لیکن اتنی اچھی اردو کیسے بول رہے ہیں"

مسٹر اناہارا بولے "قبلہ یہ اردو اور ہندی کے جھگڑے تو آپ کے ملک کو مبارک ہوں ہمیں ان جھگڑوں سے کیا لینا دینا۔ دونوں زبانوں کی گرامر تقریباً یکساں ہے۔ تھوڑی سی سنسکرت اور تھوڑی سی فارسی اور عربی سیکھ کر ہم حسب موقع آپ کی اردو اور ہندی دونوں زبانوں پر ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ ہم جاپانی کاروباری آدمی ٹھہرے۔ ایک تیر سے دو شکار کرنے کی ہمیں عادت ہے جاپان میں جو آدمی ہندی جانتا ہے وہ اردو بھی جانتا ہے اور جو اردو جانتا ہے وہ ہندی بھی جانتا ہے"۔

ہم نے دل میں سوچا کہ اے کاش ہمارے ملک میں بھی لوگ زبانوں

کے معاملہ میں کم ازکم اتنے ہی کاروباری ہوتے تو ہندی اور اردو کا جھگڑا نہ ہوتا

ٹوکیو یونیورسٹی میں ہمارے خیر مقدم کا حال تفصیل کا طلبگار ہے۔ لہذا اس قسط کو یہاں ختم کرتے ہیں۔ بس اتنا بتاتے چلیں کہ ہماری خیر مقدمی تقریب دنیا کی طویل ترین خیر مقدمی تقریب تھی جو دوپہر میں دو بجے سے رات کے بارہ بجے تک جاری رہی۔

جاپان میں مزید اردو

جاپان میں اردو اور ہندی کی تعلیم کا انتظام دو یونیورسٹیوں میں ہے۔ ایک یونیورسٹی ہے ٹوکیو یونیورسٹی برائے بیرونی مطالعات جس کا ذکر ہم پچھلی قسط میں کر چکے ہیں اور دوسری یونیورسٹی برائے بیرونی مطالعات اوساکا ہے۔ ٹوکیو یونیورسٹی کی تاریخ تقریباً سو سال پرانی ہے۔ ۱۸۸۳ء میں اسے ایک اسکول کے طور پر شروع کیا گیا تھا۔ مختلف ادوار سے گزرنے کے بعد اس ادارے کو ۱۹۴۹ء میں ٹوکیو یونیورسٹی برائے بیرونی مطالعات کا نام دیا گیا۔ یہاں دنیا کی کئی بڑی زبانوں کی تعلیم کا انتظام ہے۔ اردو اور ہندی کی تعلیم کا انتظام ہند پاک مطالعات کے شعبہ کے تحت ہے۔ چار سال کی تعلیم کے بعد طلباء کو بی۔اے کی ڈگری دیجاتی ہے۔ اور ایم۔اے کے لئے دو سال مختص ہیں۔ ہر سال مختلف جماعتوں میں اردو کے ۶۰ طلباء تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ٹوکیو یونیورسٹی کی لائبریری میں مختلف زبانوں کی دو لاکھ بیس ہزار کتابیں موجود ہیں۔

اوساکا یونیورسٹی برائے بیرونی مطالعات کی تاریخ ساٹھ سال پرانی ہے پہلی جنگ عظیم کے بعد اسے ایک اسکول کے طور پر شروع کیا گیا تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں اس ادارے کی ساری عمارتیں بمباری سے تباہ ہو گئی تھیں۔

البتہ اس کی لائبریری کی عمارت تباہ ہونے سے بچ گئی۔ مئی ۱۹۴۹ء میں اس ادارے کو یونیورسٹی کا درجہ دیا گیا۔ اس یونیورسٹی میں بھی اردو اور ہندی کی تعلیم کا انتظام ہند پاک مطالعات کے شعبہ کے تحت ہے۔ ان دونوں یونیورسٹیوں میں فارسی اور عربی کی تعلیم کا انتظام بھی موجود ہے۔ جاپان میں اردو کے طلباء پروفیسر گاموکو جاپان کے بابائے اردو کہتے ہیں۔ پروفیسر گامونے اردو تعلیم کے لئے اپنے آپ کو وقف کردیا تھا۔ وہ تینتیس 33 سال تک ٹوکیو یونیورسٹی میں اردو پڑھاتے رہے۔ ان کے شاگرد جاپان میں خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ خود پروفیسر سوزوکی بھی پروفیسر گاموکے شاگرد رہ چکے ہیں۔

ان بنیادی معلومات کے بعد آئیے اب ہم ٹوکیو یونیورسٹی کی اس محفل کا ذکر کریں جس کا ادھورا حال ہم نے پچھلی قسط میں بیان کیا تھا۔ رسمی تعارف کے بعد پروفیسر سوزوکی نے ہمیں اپنے شاگردوں کے آگے یوں ڈال دیا جیسے قدیم روم میں بھوکے شیر کے آگے مجرم کو ڈال دیا جاتا تھا۔ طلباء نے ہم سے طرح طرح کے سوالات پوچھے جن کے صحیح جوابات سچ تو یہ ہے کہ ہمیں بھی معلوم نہیں تھے۔ لیکن ہم چونکہ مہمان خصوصی تھے اس لئے جاپانیوں نے ہماری غلط معلومات پر اعتراض نہیں کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ جاپانی بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں۔ چائے کا وقفہ ہوا تو ہمیں اطمینان محسوس ہوا کہ چلو سوالات سے جان چھوٹی۔ ہم نے اس وقفے سے فائدہ اٹھا کر شعبۂ اردو کی الماریوں میں

رکھی ہوئی کتابیں دیکھنی شروع کردیں ۔ حیدرآباد اور دہلی کے کئی دوستوں کی کتابیں وہاں دیکھیں ۔ تنقیدی مضامین کے مجموعے، شعری مجموعے، ناول اور افسانوں کے مجموعے سب کچھ وہاں موجود تھے ۔ کئی رسالوں کے خاص نمبر بھی موجود تھے ۔ جوں جوں دوستوں کی کتابیں نظر سے گزرتی تھیں، ہمارے دل میں حسد کی آگ بھڑک اٹھتی تھی کیوں کہ کئی غیر ضروری کتابیں تھیں ۔ سوائے ہماری کتابوں کے ۔ جب ہم کتابوں میں غرق ہونے لگے تو پروفیسر سوزوکی نے ہمارے تجسس کو تاڑ لیا اور کہا "یہاں آپ اپنی کتابیں تلاش نہ کریں تو اچھا ہے آپ کی ایک کتاب جو آپ نے مجھے دہلی میں دی تھی وہ ہماری یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہے ۔ یہ تو صرف شعبہ اردو کی لائبریری ہے"

اس پر ہم نے کہا " اچھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ ساری اچھی کتابیں یونیورسٹی کی لائبریری میں رکھتے ہیں"

بولے" میں آپ کی خوش فہمی دور کرنا نہیں چاہتا"

ایک بات ہم نے محسوس کی کہ ان کتابوں میں ہندوستانی ادیبوں کی کتابیں اور ہندوستانی رسائل بہت کم تھے اور پاکستانی ادیبوں کی کتابیں اور رسائل زیادہ تعداد میں موجود تھے ۔ ہم نے پروفیسر سوزوکی سے دبی زبان میں اس جانبدارانہ روئیے کی شکایت کی تو بولے "ہندوستان میں اکثر اردو ادیبوں اور ایڈیٹروں کو پتہ ہی نہیں ہے کہ جاپان میں اردو کی تعلیم کا بندوبست ہے ۔

ہم سے جس طرح ممکن ہوتا ہے ہندوستانی ادیبوں کی کتابیں حاصل کرتے ہیں پاکستان کے اکثر ادیب اپنی کتابیں خود بھیج دیتے ہیں"

ہندوستان کا کوئی ادیب اپنی کتابیں ٹوکیو یونیورسٹی میں بھیجنا چاہتا ہو تو اس کی سہولت کے لئے ہم پروفیسر سوزوکی کا پتہ ذیل میں درج کئے دیتے ہیں:

PROF. SUZUKI TAKESHI

URDU DEPARTMENT,

TOKYO UNIVERSITY OF FOREIGN STUDIES

NO 514 NISHIGAHARA

KITA KU - TOKYO

شام ہوئی تو پروفیسر سوزوکی نے ہم سے کہا اب یہ جلسہ ٹیکسیوں کے ذریعہ ایک ہوٹل میں منتقل ہوگا۔ جہاں ڈنر کا انتظام ہے۔ ہم نے شاید پہلے بھی بتایا ہے کہ جاپانی ایک ہوٹل میں کھانا نہیں کھاتے۔ کم از کم دو تین ہوٹلیں ضرور بدلتے ہیں۔ لہذا اس رات دو جاپانی ہوٹلوں میں کھانا کھایا گیا۔

پروفیسر سوزوکی کے سارے طلباء ساتھ تھے۔ پہلے ہوٹل میں پہنچے تو پروفیسر سوزوکی نے بتایا کہ ابن انشاء بھی یہاں آچکے ہیں۔ ہم نے برسبیل تذکرہ پوچھا کہ "آپ کے شعبہ میں اردو کے کون کونسے ادیب آچکے ہیں؟"

بولے "ابن انشاء اور مسعود مفتی کے بعد آپ کا تیسرا نمبر ہے ۔یہاں لوگ آتے ہیں اور چپ چاپ نکل جاتے ہیں ۔ہندی شعبہ میں ہندوستان سے جینندر کمار جین کے سوائے کوئی نہیں آیا ۔"

اس رات ہمیں محسوس ہوا کہ دنیا وسیع ہونے کے باوجود بڑی چھوٹی ہے ۔ اوساکا یونیورسٹی کے اردو استاد مسٹر اسادہ نے اچانک ہم سے پوچھا "پاکستان کے ایک مشہور طنز نگار ہوا کرتے تھے ابراہیم جلیس ان کا تعلق بھی حیدرآباد دکن سے تھا ۔کیا آپ انہیں جانتے تھے ؟" ہم نے جب بتایا کہ ہم ان کے چھوٹے بھائی ہیں تو یادوں میں کھو گئے اور بولے "کراچی میں ان سے میری بیسیوں ملاقاتیں ہو چکی ہیں ۔ مجھ پر بہت مہربان رہتے تھے ۔اس طرح ہم سے تو آپ کے اور بھی کئی رشتے ہیں "

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں پروفیسر سوزوکی خود گلبرگہ جا چکے ہیں جو ہماری جنم بھومی ہے ۔ان کے علاوہ دو طلباء بھی گلبرگہ کی زیارت کر چکے ہیں ۔انہوں نے اچانک گلبرگہ کا ذکر چھیڑ دیا ۔یوں وہاں کے بازاروں وہاں کی گلیوں وہاں کے احباب کا ذکر چھڑ گیا ۔

پروفیسر سوزوکی نے کہا گلبرگہ کے احباب میں سلیمان خطیب کی یاد بہت آتی ہے ۔جب میں گلبرگہ گیا تھا تو انہوں نے میرے اعزاز میں کئی خیر مقدمی جلسے رکھے تھے ۔یہ بتائیے سلیمان خطیب کیسے ہیں ؟ کس حال میں ہیں ؟"

ہم نے کہا "پروفیسر سوزوکی شاید آپ کو پتہ نہیں سلیمان خطیب اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ انھیں دنیا سے رخصت ہوئے تین سال بیت گئے"۔

پروفیسر سوزوکی اچانک گہرے غم میں ڈوب گئے۔ ساری محفل پر خاموشی چھا گئی۔ وہ کچھ دیر سر جھکائے بیٹھے رہے۔ پھر بولے "مجتبیٰ صاحب کبھی کبھی لاعلمی کے بھی کئی فائدے ہوتے ہیں۔ سلیمان خطیب آپ کے لئے تین برس پہلے مر گئے۔ میرے لئے تو وہ آج تک بلکہ کچھ لمحے پہلے تک بھی زندہ تھے" یہ کہہ کر وہ کچھ دیر تک خاموش رہے۔ پھر اچانک اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے اب محفل برخاست کی جائے تو مناسب ہے میرے طلباء آپ کو آپ کے ہوٹل چھوڑ آئیں گے"

اس طرح جو محفل دن میں دو بجے خیر مقدمی تقریب کے طور پر شروع ہوئی تھی وہ رات میں بارہ بجے ایک تعزیتی جلسے کے روپ میں ختم ہوگئی۔ ہم سوچتے رہے انسان براعظموں اور ملکوں میں بٹ جانے کے باوجود ایک دوسرے سے کس قدر جڑا ہوا ہے۔

پروفیسر سوزوکی چلے گئے تو مسز شاشورے اور ہاگیتا ہیروشی ہمارے ساتھ رہ گئے۔ ہوٹل سے باہر نکلے تو سامنے ہی ایک جوئے خانہ نظر آیا۔ جاپان میں جگہ جگہ آپ کو ایسے جوئے خانے نظر آجائیں گے۔ جنہیں جاپانی میں پچنکو کہتے ہیں۔ یہاں طرح طرح کی مشینیں نصب ہوتی ہیں۔ جن میں پیسے ڈال کر

آپ اپنی قسمت آزما سکتے ہیں ۔ دوسرے دن سمینار کی چھٹی تھی ۔ ہم نے شاشورے سے کہا بی بی ہم نے کئی جاپانی دوستوں سے ان مشینوں کی ترکیب استعمال کے بارے میں پوچھا مگر کوئی ہمیں ٹھیک ڈھنگ سے سمجھا نہ سکا ۔ آپ اہل زبان ہیں آپ اردو میں سمجھائیں تو پتہ چلے کہ آخر یہ کیا کھیل ہے ۔ مسز شاشورے نے ہمیں ان مشینوں کے بارے میں سلیس اردو میں نہ صرف سمجھایا بلکہ ہماری طرف سے اپنی جیب سے پیسے نکال کر مشینوں میں ڈالے اور خوب ہاریں ۔ بعد میں مسز شاشورے کی ہدایت کے مطابق ہم نے ٹوکیو کے کئی جوئے خانوں سے استفادہ کیا اور ماشاء اللہ کافی رقم جیتی اگر وہ یہ گر اردو میں نہ سکھاتیں تو گھاٹے میں رہتے ۔ ہم جب اس محفل سے اپنے ہوٹل پہنچے تو رات کے دو بج رہے تھے ۔

اردو کا ذکر چل ہی نکلا ہے تو کیوٹو کی ایک شام کا بھی ذکر ہو جائے ۔ اوساکا یونیورسٹی کے اردو استاد مسٹر اسادہ نے ہم سے کہہ رکھا تھا کہ جب آپ جاپان کی قدیم راجدھانی کیوٹو آئیں تو اوساکا بھی ضرور آئیں ۔ کیوٹو سے اوساکا کی مسافت بلیٹ ٹرین سے صرف آدھے گھنٹے کی ہے بعد میں ہم کیوٹو پہونچے تو ہمیں بتایا گیا کہ کیوٹو میں تین دن کی سیر کا پروگرام بھی یونیسکو کے ہر پروگرام کی طرح بے حد کسا ہوا ہے ۔ لہذا آپ اوساکا نہیں جاسکتے ۔

ہم نے پرفیسر اسادہ کو کیوٹو سے فون کیا تو ان کی بیگم صاحبہ نے فون

اٹھایا۔ہم نے انگریزی میں مسٹر اسادہ کو پوچھا۔ تو انہوں نے ہمارا نام پوچھا ہم نے نام بتایا تو السلام علیکم کے بعد سلیس اردو میں بولیں" مسٹر اسادہ آپ ہی کی خاطر آج گھر سے باہر نہیں نکلے ہیں۔آپ کب اوساکا آرہے ہیں"

ہم نے اپنی مجبوری بتائی تو مسٹر اسادہ خود فون پر آگئے اور بولے" اگر آپ اوساکا نہیں آسکتے تو میں اپنے طلباء کو لے کر آتا ہوں ہم لوگ شام میں آپ کے ہوٹل پہنچ جائیں گے"

کیوٹو کی وہ شام کتنی حسین تھی ہم بیان نہیں کر سکتے۔ پروفیسر اسادہ دو ٹیکسیوں میں اپنے طلباء کو لے کر ہمارے ہوٹل پر پہنچے۔ایک طالبہ جاپان کے شہر نارا کی رہنے والی ہیں۔اردو میں ایم۔اے کر رہی ہیں۔ہندوستان کا بھی دورہ کر چکی ہیں۔ بہت شستہ اردو بولتی ہیں۔ پروفیسر اسادہ اور مسز اسادہ پاکستان میں کئی سال رہ چکے ہیں۔ان کی شادی بھی اسلامی طریقہ سے ہوئی تھی وہ جب اردو بولتے ہیں تو لگتا ہے کوئی پنجابی اردو بول رہا ہے۔ پروفیسر اسادہ ان دنوں ڈپٹی نذیر احمد کے ناول "توبتہ النصوح" کا جاپانی ترجمہ کر رہے ہیں۔ رات دو بجے تک ہم ہوٹل بدل بدل کر اردو کے بارے میں بات چیت کرتے رہے۔اوساکا یونیورسٹی کے طلباء کا تجسس اور اشتیاق ہمیں بہت بھلا لگا۔ پروفیسر اسادہ اور ان کے طلبا اس رات یہیں رک گئے۔کیوٹو کی سیر کے بعد جب ہم ٹوکیو پہنچے تو پروفیسر اسادہ کا محبت بھرا خط آیا رکھا تھا۔

جاپان کے اردو اساتذہ اور اردو طلباء نے ہمیں جو محبت دی اس کا اظہار کم از کم اردو میں نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ ہمیں اپنے جذبات کے اظہار کے لئے مناسب الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔ یوں بھی بہت سے سچے جذبے اظہار کے محتاج نہیں ہوتے۔

جاپان میں ہم لکھ پتی بن گئے

پیسے کو ہم ہاتھ کی میل سمجھتے ہیں۔ چنانچہ جب سے جاپان آئے ہیں ہم کھانا کھانے سے پہلے اور کھانا کھانے کے بعد ہاتھ نہیں دھوتے۔ اسکی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہم نے جاپان آنے کے بعد Chop Sticks (لکڑی کی کاڑیوں) سے کھانا سیکھ لیا ہے اور اس فن میں وہ ید طولیٰ حاصل کیا ہے کہ خود جاپانی بھی ہمارا منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ جاپانیوں کی اکثریت ہوٹلوں میں کھانا کھاتی ہے ان کے برآمدوں میں ایک شوکیس رکھا ہوا ہوتا ہے اور اس شوکیس میں وہ سارے کھانے جو اس ہوٹل میں دستیاب ہوسکتے ہیں اور ہر کھانے کے برابر اسکی رائج الوقت قیمت بھی لکھی ہوتی ہے۔ آپ بیرے کو شوکیس میں رکھے ہوئے کھانے کا نمونہ بتادیں اور ایک چوکی کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ جائیں بیرا پہلے آپ کے سامنے گرم پانی میں کھولتا ہوا ایک تولیہ لاکر رکھ دے گا آپ اس تولیہ کی مدد سے حسب استطاعت اپنا منہ صاف کریں۔ آپ چاہیں تو ہاتھ بھی صاف کرسکتے ہیں۔ پھر آپ کے سامنے بیرا چاپ اسٹکس لاکر رکھ دے گا اس کے بعد آپ کا مطلوبہ کھانا آئے گا۔ ہم نے پہلے ہی دن سے دانہ چگنے کے لئے چاپ اسٹکس کا استعمال شروع کردیا تھا۔ اسکی ترغیب ہمیں ہندوستانی سفارت گھر کی تھرڈ سکریٹری مسز پریم روز شرما نے دی تھی۔ یونیسکو سمینار کی

افتتاحی تقریب میں مسز پریم روز شرما ہم سے ملنے کے لئے بطور خاص آئیں تھیں اور ان کے آنے سے ہماری ہمت کی خاصی افزائی ہوئی تھی۔ وہ پچھلے دو برسوں سے جاپان میں مقیم ہیں افتتاحی تقریب کے بعد ایشیائی ثقافتی مرکز نے جو ظہرانہ ترتیب دیا تھا اس میں ہم مسز پریم روز شرما کے توسط سے جاپانی کھانوں کے بیشتر اسرار و رموز سے واقف ہو گئے تھے۔ جاپانی بڑے حسن پرست ہوتے ہیں۔ لہذا اپنے کھانوں کو بھی حسین اور خوبصورت بنانے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ میز پر کھانے کی جو اشیا سجائی جاتی ہیں ان میں کھانے کی اشیاء کم اور پھول اور پتے زیادہ ہوتے ہیں۔ پھولوں کی سجاوٹ کو جاپان میں ایک الگ فن کی حیثیت حاصل ہے۔ جسے "اکیبانہ" کہتے ہیں۔ کھانے کی اشیاء کے اطراف انواع و اقسام کے پھول کے گلدستے اور پتے رکھے ہوتے ہیں۔ آدمی میں اتنی تمیز ہونی چاہیئے کہ وہ پھول پتے نہ کھائے بلکہ صرف کھانے پینے کی اشیاء پر ہی اکتفا کرے (ویسے جاپانی کھانے کو ہر چیز کھا لیتے ہیں) بعض پھول پتے اتنے خوبصورت ہوتے ہیں کہ آدمی انہیں سلاد کے دھوکے میں کھا سکتا ہے۔ چنانچہ ہمارے ایک ساتھی نے مذکورہ ظہرانے میں کھانا کم اور حسن زیادہ کھایا تھا۔ یعنی دو چار خوبصورت پھول کھا لئے تھے اور کچی سبزی کے طور پر نہ جانے کون سے پتے کھا لئے تھے ہم بھی شاید یہی کرتے اگر مسز پریم روز شرما ہماری رہبری نہ فرماتیں۔ مسز شرما نے ہی ہمیں سلیس ہندوستانی میں بتایا تھا کہ جاپانی کھانا

کھاتے وقت نہ صرف اپنے پیٹ کی غذا کا بلکہ اپنی روح کی غذا کا بھی بندوبست کرتا ہے۔ہم پیٹ کی غذا سے اتنے گھبرائے کہ بعد میں جتنی بھی دعوتیں ہوئیں ان میں سلاد کو ہاتھ نہیں لگایا۔ مرغ کی سالم ٹانگیں اور سالم مچھلی ہی کھاتے رہے۔

معاف کیجئیے ہم اصل موضوع سے بھٹک گئے ورنہ ہم تو آج اہل وطن کے دل میں یہ کہہ کر حسد کی آگ کو بھڑکانا چاہتے تھے کہ جاپان آنے کے بعد ہم لکھ پتی بن گئے ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں،ہم پیسے کو ہم ہاتھ کی میل سمجھتے ہیں۔ مزاج بھی قلندرانہ پایا ہے۔ جیب میں دس پیسے ہوں یا دس ہزار روپئے ہوں تب بھی ہماری ذات میں کوئی نفسیاتی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔ بس فرق اتنا ہے کہ جیب میں دس پیسے ہوں تو پیدل چلتے ہیں اور دس ہزار روپئے ہوں تو ٹیکسی میں اڑتے پھرتے ہیں۔ مال ومتاع سے زندگی بھر بے نیاز رہے اور بفضلِ تعالیٰ دولت بھی ہم سے بے نیاز رہی۔ مگر اس کے باوجود ہماری قسمت میں جاپان آنے کے بعد لکھ پتی بننا لکھا تھا ٹوکیو پہنچنے کے بعد اٹھارہ گھنٹوں تک ہمیں اپنی جیب سے ایک پیسہ بھی خرچ کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ لہٰذا اس قلیل مدت میں ہمیں ٹوکیو کے آٹے دال کا بھاؤ نہیں معلوم ہو سکا تھا۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ سمینار کی افتتاحی تقریب کے بعد ہمیں پندرہ دنوں کا بھتہ دیا جائے گا۔ تاکہ ہم جاپان میں موج منا سکیں۔ سو سمینار کے بعد جب ہماری خدمت میں ایک لاکھ ۶۵ ہزار ین کا نذرانہ پیش کیا گیا تو ہم حیران رہ گئے۔ دبی زبان میں

کہا بھی کہ ہم اتنی ساری دولت لے کر کیا کریں گے ۔ہم تو ننانوے کے پھیر میں ہی پریشان رہتے ہیں ۔ لاکھوں کا حساب کتاب کہاں رکھیں گے ۔ اتنی بھاری دولت سے کہیں ہمارا کردار خراب نہ ہو جائے اور ہمیں اپنا کردار بے حد عزیز ہے جو روپئے پیسے کی تنگی کا سلسلہ اخلاقیات سے جوڑ کر مطمئن ہو جاتا ہے مگر ہم سے کہا گیا کہ یہ یونیسکو کا بھتہ ہے جسے آپ کو لینا ہی پڑے گا ۔ اس میں تکلف کی کوئی بات نہیں ۔ رہا دولت کی فراوانی کا معاملہ تو بھیا ٹوکیو میں جب گھومنے جاؤ گے تو خود تمہیں اپنی امارت کا اندازہ ہو جائے گا ۔

غرض لکھ پتی بننے کی خوشی میں پہلی ہی رات کو ہم نے ایک دوست کو رات کے کھانے پر بلایا ۔ ہم نے ایک جاپانی ریستوراں میں ذرا جم کے کھانا کھایا ۔ جم کے کھانے سے مراد یہ ہے کہ مرغ کا گوشت منگوایا اور ساتھ میں مچھلیاں بھی منگوائیں ۔ سنگترے کا رس تو ہر کوئی منگاتا ہی ہے ۔ بل آیا تو پتہ چلا کہ ہم پانچ ہزار ین کی بھاری رقم سے محروم ہو گئے ۔ بھتہ چونکہ پندرہ دنوں کا تھا اس لئے ہم نے مستقبل کے سارے ناشتوں لنچوں اور ڈنروں کا متوقع حساب جوڑا تو احساس ہوا کہ اگر اسی رفتار سے ہم ٹوکیو میں کھانا کھاتے رہے تو جملہ پینتیس دنوں کے قیام میں ہمیں آخری سات دنوں میں بھوکوں مرنا پڑے گا کہنے کو ہم لکھ پتی ضرور بن گئے تھے ۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ہمیں اپنی غربت کا احساس بھی شدت سے ہو رہا تھا ۔ ہماری امارت اور غربت میں اتنا کم فاصلہ تھا

کہ لگتا تھا ہمیں ٹوکیو میں قیام کے دوران میں پل صراط پر سے گزرنا پڑے گا۔

آئیے ذرا جاپانی ین کا حال بیان ہو جائے۔ ۲۱۰ ین کا ایک امریکی ڈالر ہوتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ ۲۱۰ ین میں ہمارے ساڑھے سات روپئے بنتے ہیں۔ یہاں اشیاء کی قیمتیں ہزاروں میں ہیں۔ ایک ین تو کجا دس ین کے سکے بھی رائج ہیں۔ سو ین کا کوئی کرنسی نوٹ نہیں ہوتا صرف سکہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد پانچ سو ین ایک ہزار ین، پانچ ہزار ین دس ہزار ین، اور پندرہ ہزار ین کے کرنسی نوٹ ہوتے ہیں۔ ان کرنسی نوٹوں کی ریز گاری کے لئے آپ کو دکانوں کے چکر لگانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جگہ جگہ ریزگاری کی مشینیں نصب ہوتی ہیں۔ ایک ہزار ین کا کرنسی نوٹ مشین میں ڈالئے اور ریزگاری حاصل کرلیجئیے۔ کبھی آپ غلط کرنسی نوٹ مشین میں ڈالیں تو مشین اس نوٹ کو پھر آپ کی خدمت میں واپس کردیتی ہے نہ آپ مشین کو دھوکہ دے سکتے ہیں اور نہ ہی مشین آپ کو دھوکہ دیتی ہے۔ جاپانیوں کی طرح ان کی مشینیں بھی بڑی ایماندار ہوتی ہیں۔ ابتداء میں ہمیں اپنا کرنسی نوٹ مشین میں ڈالتے ہوئے بڑی گھبراہٹ ہوتی تھی۔ کیا پتہ کہ مشین ہمارا کرنسی نوٹ ہڑپ کر جائے۔ ہندوستان میں وزن کرنے والی مشینوں کے معاملے میں اکثر ہمارے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ ادھر دس پیسے کا سکہ ڈالا اور ادھر مشین نے ہضم کرلیا بعد میں گھونسوں اور لاتوں سے مشین کی تواضع کرنی پڑتی ہے تب بھی وزن کا کارڈ

برآمد نہیں ہوتا۔ جاپان میں کبھی کسی مشین کو گھونسے رسید کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ بڑی خوددار اور ایماندار مشینیں ہوتی ہیں۔

غرض جاپانی لاکھوں میں کھیلتے ہیں اور لاکھوں کا حساب کتاب رکھتے ہیں ہم تو پانچ ہزار ین کا کھانا کھا کر ہی پریشان تھے۔ بعد میں جاپانی دوستوں نے ہماری جو دعوتیں کیں تو دیکھا کہ یار لوگ ایک ہی ڈنر کا بل ایک لاکھ ین تک ادا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ہم نے اپنے ایک جاپانی دوست شنجی تاجیما سے کہا بھی کہ آپ لوگ لاکھوں میں حساب کتاب کیوں رکھتے ہیں۔ ہمیں بڑی پریشانی ہو رہی ہے۔ ہم تو دو ہزار روپیوں تک کا حساب کتاب جانتے ہیں۔ کیونکہ ہمیں اتنی ہی تنخواہ ملتی ہے اس کے بعد کی گنتی ہمیں نہیں آتی۔

بولے "یہ آپ کی مجبوری ہے۔ میری مجبوری یہ ہے کہ مجھے چار لاکھ ین تنخواہ ملتی ہے۔ پھر چار لاکھ کا حساب کتاب رکھنا کونسا مشکل کام ہے۔ ایک کیالکولیٹر خرید لیجئیے۔ جاپانی ہر کام کیالکولیٹر کی مدد سے کرتے ہیں۔ آپ وقت پوچھیں تو اپنی جیب سے کیالیکولیٹر نکال کر وقت بتادیں گے۔ سو ین میں سے کسی کو پچاس ین دینا ہو تو تب بھی کیالکولیٹر کو یہ بتانے کے لئے زحمت دیں گے۔ سو میں سے پچاس ین منہا کئے جائیں تو کتنے ین بچتے ہیں اگر آپ پوچھیں کہ آج کیا دن ہے تو تب بھی کیالکولیٹر کا بٹن دبا کر بتادیں گے۔ تاریخ بھی اسی کیالکولیٹر کی مدد سے بتائی جاتی ہے ہر جاپانی کی جیب میں ایک کیالکولیٹر رکھا ہوتا

ہے ۔ جس کے ذریعہ مشکل سے مشکل حساب کو آسان کیا جاتا ہے ہمارے دوست شنجی تاجیما نے ایک بار ہماری تاریخ پیدائش پوچھی ہم نے تاریخ بتائی تو آدھے منٹ میں کیالکولیٹر کو زحمت دے کر بتادیا کہ ہم جمعرات کے دن پیدا ہوئے تھے ۔ ہم نے سکندر اعظم کی تاریخ وفات بتائی تو انہوں نے سکندر کے مرنے کا دن بتادیا ۔ ہم نے بعد میں شکسپیر کے مرنے کا دن بھی اسی سے معلوم کیا ۔ کیالکولیٹر بڑے کام کی چیز ہے ۔ ہم نے اس کا استعمال سیکھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے ۔ اب ٹوکیو میں اپنا سارا حساب کتاب جاپانی دوستوں کی مدد سے رکھتے ہیں ۔ جیسا کہ ہم نے بتایا ہے یہاں اشیاء کی قیمتیں سینکڑوں اور ہزاروں میں ہوتی ہیں ۔ دو سو ین میں سگریٹ کی ڈبیا آتی ہے ۔ آدھی ڈبل روٹی سو ین کی ہوتی ہے ۔ مرغ کی ایک ٹانگ پانچ سو ین کی، سستی چپل ایک ہزار ین کی اور جاپانی چھتری دو ہزار ین کی ہوتی ہے ۔ اپنے سوٹ کو استری کروائیے تو تین سو ین نکالئے ۔ کافی کا ایک پیالہ پیئیں تو تین سو ین دیجئے ۔ جاپان میں ہمیں ایک ہی چیز سستی نظر آئی وہ ہے ٹیلیفون کال ۔ مشین میں دس ین کا سکہ ڈال کر بات کرتے چلے جائیے ۔ جتنی دیر بات کرنی ہو اس حساب سے آپ کو وقفہ وقفہ سے دس ین کے سکے ڈالتے رہنا پڑتا ہے ۔ کسی بھی فون سے آپ سارے جاپان میں کسی سے بھی بات کر سکتے ہیں ۔ فرق یہ ہے کہ کسی دور دراز شہر میں کسی سے بات کرنی ہو تو سو ین کا سکہ مشین میں ڈالنا پڑتا ہے ۔ ہم ٹوکیو سے اکثر

اوساکا کو فون ملاتے ہیں جو پانچ سو کیلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے ۔ اور اوساکا یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر اسادہ سے بات کرتے ہیں ۔ کبھی غلط نمبر نہیں ملا ۔ جاپانی ٹیلیفون کی خوبی یہ ہے کہ اگر مطلوبہ شخص کو فون پر بلانے میں دیر ہورہی ہو اور آپ کو انتظار کرنا پڑرہا ہو تو اتنی دیر میں ٹیلیفون پر آپ کو موسیقی سنائی جاتی ہے تاکہ آپ کا وقت ضائع نہ ہو ۔ ٹیلیفون کی سہولت ہر جگہ موجود ہوتی ہے ۔ ہم ایک بار جاپان کے ایک گاوں میں گئے ۔ صبح کے وقت جنگل کی سیر کو نکلے تو دیکھا کہ گھنی جھاڑیوں میں ایک ٹیلیفون بوتھ لگا ہوا ہے ۔ ہم نے پوچھا اس فون کا یہاں کیا کام ۔ ہمیں بتایا گیا کہ اگر ہم خدا نخواستہ راستہ بھٹک گئے تو اس فون کی خدمات سے استفادہ کیا جاسکتا ہے ۔

غرض حضرات ! ہم جاپان میں لکھ پتی بن گئے ہیں ۔ لیکن ہماری گزارش یہ ہے کہ آپ ہماری غربت پر اظہار ہمدردی کریں اور دعا کریں کہ خدا ہمیں یہاں عزت کی زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے ۔ وطن عزیز کی یاد بہت آتی ہے جہاں ایک روپیہ میں سگریٹ کی ڈبیا مل جاتی ہے ۔ چار روپیئے میں ہم پیٹ بھر کھانا کھالیتے ہیں ۔ پچاس پیسے میں اپنے سوٹ کو استری کرواتے ہیں ۔ ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ وطن واپس ہونے کے بعد کبھی گرانی کی شکایت نہیں کریں گے کیونکہ جس نے ٹوکیو کی گرانی دیکھی ہے وہ کسی گرانی کو گرانی نہیں سمجھتا ۔۔

مہذب پانی اور
غیر مہذب پانی

جاپان جانے سے پہلے ہمیں پانی کی دو ہی قسمیں معلوم تھیں ۔ کھارا اور میٹھا پانی ۔ جاپان گئے تو پتہ چلا کہ یہاں پانی کی دو اور قسمیں رائج ہیں ۔ مہذب پانی اور غیر مہذب پانی ۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ وہاں بوتلوں اور بالٹیوں میں بند پانی مہذب اور دریاؤں میں بہنے والا پانی غیر مہذب ہوتا ہے ۔ سچ پوچھئیے تو اس تقسیم میں بیچارے پانی کا نہیں بلکہ جاپانی کا قصور ہے کہ وہ ہر شئے میں اپنی تہذیب کو ملادیتا ہے ۔ وہاں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنا بہت دشوار کام ہے ۔ جاپان جانے کے بعد پتہ چلا کہ جاپانی پینے کے نام پر کم سے کم پانی پیتے ہیں اور دیگر مشروبات زیادہ پیتے ہیں ۔ ہم ٹھیرے بلا کے آب نوش ۔ کھانا کھاتے وقت بھی پانی کے گھونٹ کے ذریعہ نوالے کو حلق سے نیچے اتارتے ہیں ۔ چائے پینا بھی ہو تو پہلے گلے کو ٹھنڈے پانی سے صاف کرتے ہیں ۔

جاپانی کھانا کھانے سے پہلے "گرین ٹی" یعنی سبز چائے پیتے ہیں اور کھانا کھانے کے بعد بھی اسی سبز چائے کو زحمت دیتے ہیں ۔ اگر سبز چائے پینے کا من نہ ہو تو پھر وہاں پینے کے لئے پانی کے سوائے ہر چیز موجود ہوتی ہے ۔ ہمیں بھی ابتداء میں کھانے کے ساتھ یہی سبز چائے پیش کی گئی تو ہم نے اس مشروب کو

اسی طرح پیا جیسے ہم ہندوستانی کڑوی دوا پیتے ہیں ۔ سبز چائے میں ہمیں کہیں "چائے" نہیں دکھائی دی البتہ اس مشروب کا رنگ ضرور سبز تھا ۔ اس میں نہ دودھ ہوتا ہے نہ شکر ۔ یوں کہئیے کہ بالکل ننگی چائے ہوتی ہے ۔ ہم چائے پیتے ہیں تو چائے کے ساتھ بہت کچھ پی جاتے ہیں ۔ ہمارے ایک دوست ہمیں چائے کے ساتھ دارچینی الائچی اور زعفران تک پلادیتے ہیں ۔ ایسی چائے پینے والے کو بھلا کہاں سبز چائے سے تشفی ملتی ۔ اگرچہ پورا ایک دن منہ بنا بنا کر سبز چائے کو پیتے رہے ۔ دوسرے دن ہم سے نہ رہا گیا ۔ جب ناشتے میں پھر سے سبز چائے پیش کی گئی تو پانی سر سے اونچا ہو گیا ۔ ہم نے اپنے جاپانی دوست شنجی تاجیما سے پوچھا "کیا آپ لوگ پانی نہیں پیتے ۔ بہت اچھی چیز ہوتی ہے" ۔

تاجیما نے کہا "پانی تو دریا میں بہنے، آسمان سے برسنے، ساحل سے ٹکرانے اور فواروں سے اڑنے کے لئے ہوتا ہے ۔ ہم پانی پیتے تو ہیں مگر خاص موقعوں پر ۔"

ہم نے کہا "پانی کے جو فرائض آپ نے بیان کئے ہیں وہ اپنی جگہ درست ہیں بلکہ ہماری ہندوستانی فلموں میں بھی پانی کے یہی فرائض ہوتے ہیں ۔ تاہم اگر آپ ہمیں خاص خاص موقعوں پر اپنی سبز چائے اور عام موقعوں پر پانی پلایا کریں تو زیادہ مناسب ہے ۔ یہ تو بتائیے کہ جاپانی میں "پانی" کو کیا کہتے ہیں ؟"

تاجیما نے ذہن پر زور دے کر کہا "میزو" کہتے ہیں (انہیں ذہن پر زور دینے کی ضرورت اس لئے پیش آئی جو چیز استعمال ہی نہیں کرتے اس کا نام کیوں یاد

رکھیں)۔

اس کے بعد اگلے دو تین دن تک ہمارا یہ معمول بن گیا کہ جیسے ہی کسی ہوٹل میں داخل ہوتے "میزو" کی گردان کرتے پہونچتے۔ میزو۔ میزو کی اتنی تکرار کرتے کہ ہمارے سامنے میزو کے چار پانچ گلاس رکھ دیئے جاتے۔

چوتھے دن ہم اپنی مترجم کے ساتھ ایک ہوٹل میں گئے اور ہم پر حسب معمول دورہ میزو پڑا تو ہماری بی بی مترجمہ نے ہمارے کان میں کہا "مسٹر حسین! پانی شوق سے پیجئیے مگر ذرا تہذیب کے ساتھ"

ہم نے کہا "بی بی! آداب مئے نوشی تو ہمارے پاس بھی ہوتے ہیں۔ لیکن آداب آب نوشی کے بارے میں پہلی بار سنا ہے۔ کیا آپ یہ چاہتی ہیں کہ ہم پانی کے پیگ بنا کر پئیں اور پانی پینے کے بعد ہمارے قدم لڑکھڑائیں"

بولیں "آپ نے میری بات کا مطلب نہیں سمجھا۔ میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ پانی کا جو آپ جاپانی نام لے رہے ہیں خاصا غیر مہذب نام ہے۔ پانی کا مہذب اور شائستہ نام "اومیا" ہے۔ آپ تو پڑھے لکھے اور مہذب آدمی ہیں لہذا آپ کو "اومیا" پینا چاہئیے "میزو" نہیں"۔

ہم نے پوچھا "تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم پچھلے تین دنوں سے جاپان میں غیر مہذب پانی پیتے آرہے ہیں۔ یہ بتائیے کہ میزو کے نام پر جو پانی آتا ہے اس میں اور اومیا والے پانی میں کیا فرق ہوتا ہے"

بولیں "پانی تو دونوں ہی یکساں ہوتے ہیں مگر اصل اہمیت تہذیب کی ہوتی ہے اگر آپ پانی کا غیر شائستہ نام اپنی زبان پر لانے کے بجائے شائستہ نام زبان پر لائیں تو اس سے آپ کی پیاس بھی بجھ جائے گی اور تہذیب بھی سیراب ہوگی۔

اس کے بعد جاپان میں ہم جتنے دن رہے " اوہیا " پیتے رہے اور اپنی تہذیب کو سیراب کرتے رہے میزو کو بالکل ہاتھ نہ لگایا ہم اس کے بعد مہذب ناموں اور غیر مہذب ناموں کے چکر سے اس قدر خوفزدہ ہوگئے کہ ہر شئے کا جاپانی نام معلوم کرنے کے بعد پوچھتے کہ کہیں اس کا کوئی غیر مہذب نام تو نہیں ہے ۔ ایک بار خود اپنی بی بی مترجمہ سے رازداری کے انداز میں پوچھا "بی بی! یہ جو آپ کا نام ہے وہ مہذب ہے یا غیر مہذب"
شرم کے مارے اپنے کانوں کی لوؤں کو تک سرخ کرتی ہوئی بولیں" مسٹر حسین! آپ بڑے غیر مہذب سوالات پوچھتے ہیں"

جاپانیوں کی تہذیب کے بارے میں اگر لکھنے پر آئیں تو دفتر کے دفتر لکھ سکتے ہیں لہذا ہمارے تھوڑا لکھے کو بہت جانئیے ۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ دنیا بھر میں یہی وہ واحد قوم ہے جس نے مشینوں سے رشتہ جوڑنے کے باوجود اپنی تہذیب کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا ۔ سارا جاپان صبح سے لے کر رات تک مشینوں اور اپنی تہذیب کے درمیان ایک خوشگوار ہم آہنگی پیدا کرنے

میں مصروف رہتا ہے اور بالکل نہیں تھکتا۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ ایک جاپانی اپنی زندگی میں جتنے " شکریے " ادا کرتا ہے وہ ہم چار جنم میں بھی ادا نہیں کرسکتے ۔ چنانچہ ہر جگہ ہر مقام پر آپ کو جاپانی ایک دوسرے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دکھائی دیں گے ۔ ہمیں شکایت رہتی ہے کہ ہمیں شکریئے کے لئے مناسب الفاظ نہیں ملتے ۔ بر خلاف اس کے جاپانیوں کے شکریئے میں اتنے الفاظ ہوتے ہیں کہ ایک سانس میں پوری دلجمعی کے ساتھ آپ شکریہ نہیں ادا کرسکتے ۔ ہم کسی کے احسان کو صرف "شکریہ" یا" دھنیہ واد" یا" تھینک یو" کہہ کر ٹال دیتے ہیں ۔ لیکن جاپانی میں آپ جب تک " دوموآرئی گاتو گزائی مشتہ " نہ کہیں تب تک محسن نہیں ٹلتا ۔ پھر احسان اور شکریہ کا رشتہ بھی نازک ہوتا ہے ۔ کسی نے آپ کو راستہ دیا تو فوراً تعظیماً جھک کر اس کی خدمت میں ایک عدد" دوموآرئی گاتو گزائی مشتہ "پیش کر دیجئے ۔ آگے چل کر کسی سے آپ نے پتہ پوچھا اور وہ پتہ نہ بتاسکا تو تب بھی جھک کر اسے " دوموآرئی گاتو گزائی مشتہ " سے نوازیئے ۔ جاپانی ہر چھوٹی موٹی بات کا " دوموآرئی گاتو گزائی مشتہ " بنا دیتے ہیں ۔ ہم شخصی طور پر جاپانیوں کی طرح اتنے مہذب نہیں ہیں لیکن پھر بھی یہ حالت ہوگئی تھی ۔ کہ ایک دن کوریا کے مندوب مسٹر کم نے جنکا کمرہ ہمارے کمرے سے متصل تھا کہا کہ " مسٹر حسین! آپ آدھی رات کو اپنے کمرے میں کس کا شکریہ ادا کرتے رہتے ہیں ۔ آخر وہ کون ہے جس کی خدمت میں آپ

وقفہ وقفہ سے "دو مورآرئی گاتو گزائی مشتہ" پیش کرتے ہیں" مسٹر کم کے توجہ دلانے پر ہمیں احساس ہوا کہ ماشاءاللہ اب ہم نیند میں بڑبڑانے کے لئے بھی" دو موآرئی گاتو گزائی مشتہ" کا استعمال کرنے لگے ہیں۔

آپ تو جانتے ہیں کہ ہمارے حصے میں شہرت اور مقبولیت کچھ زیادہ ہی آئی ہے۔ ٹوکیو پہونچے تو احساس ہوا کہ ہم ٹوکیو میں پہلے ہی سے خاصے مقبول ہیں اور ہماری شہرت سارے جاپان میں پھیلی ہوئی ہے چنانچہ کسی ہوٹل میں جاتے یا کسی اسٹور میں داخل ہوتے تو سیلز گرلس ہمارا نام لے لے کر پکارنا شروع کردیتی تھیں ۔ اور ہم سیدھے سیلز گرلس کے سامنے جا کر کھڑے ہو جاتے تھے کہ محترمہ آپ نے ہمیں یاد کیا۔ بتائیے ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں۔" اس پر سیلز گرلس جھینپ کر کہتیں کہ " یہ آپ کیا کہتے ہیں خدمت تو ہم آپ کی کرنا چاہتے ہیں۔"

تین چار دنوں تک یہ معمہ سمجھ میں نہ آیا۔ ایک دن یونیسکو کے ایشیائی ثقافتی مرکز کے ڈائرکٹر مسٹر یماکا سے کہا" مسٹر یماکا! مانا کہ ہم بہت مشہور ادیب ہیں اور ہماری شہرت کے ڈنکے چار دانگ عالم میں بجتے ہیں۔ لیکن جاپان آنے کے بعد ہمیں یوں محسوس ہو رہا ہے کہ ہم یہاں ہندوستان سے زیادہ مشہور ہیں جس کسی ڈپارٹمنٹل اسٹور میں جاتے ہیں سیلز گرلس ہمارا نام لے کر پکارتی ہیں لیکن جب ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں تو انجان بن جاتی ہیں"

مسٹر یماکا نے ایک زوردار قہقہہ لگا کر کہا" مسٹر حسین آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اصل میں وہ" سیما سین" کہتی ہیں اور ان کا تلفظ کچھ ایسا ہوتا کہ آپ اس" سیما سین" کو مسٹر حسین سمجھ لیتے ہیں"۔

ہم نے پوچھا" یہ سیما سین" کیا چیز ہوتی ہے۔ پتہ چلا کہ" سیما سین" ایک لفظ نہیں پوری ڈکشنری ہے اس کے کئی معنی ہیں اور ہر معنی کے رنگ مختلف ہیں اس کے ایک معنی ہیں" معاف کیجئیے" دوسرے معنی ہیں" آپ کی توجہ کے محتاج ہیں" تیسرے معنی ہیں" آپ کی مہربانی" چوتھے معنی ہیں" آپ کی کیا خدمت کی جائے" اس لفظ کے دس بارہ اور بھی مفہوم ہیں جو اب ہمیں یاد نہیں رہے۔ یہ لفظ ایک ایسا کوزہ ہے جس میں دریا بند ہے۔ اس لفظ کے معنی معلوم ہوئے تو ہم نے اپنی شہرت کو تہہ کر کے الگ رکھا اور خود " سیما سین" " سیما سین" کا ورد کرنے لگے۔

جاپانی ملاقات کے وقت مصافحہ کرنے یا ہاتھ اٹھا کر سلام کرنے کے روادار نہیں ہوتے۔ ہماری تربیت کچھ ایسی ہوئی ہے کہ نہ صرف مصافحہ کرنے کو ضروری سمجھتے ہیں بلکہ موقع ملے تو ملاقاتی سے گلے مل کر اس کی پسلیوں کی مضبوطی کا امتحان بھی لیتے ہیں۔ ہم سے دو چار دنوں تک یہ بد تہذیبی سرزد ہوتی رہی کہ دھڑا دھڑ جاپانیوں سے مصافحہ کرتے رہے۔ یہ اور بات ہے کہ جس کسی سے مصافحہ کرتے وہ فوراً اپنے ہاتھ دھونے کے لئے بھاگتا تھا۔ آخر کو سمجھدار

آدمی ہیں ۔ تاڑ گئے کہ ہمارے مصافحے اور بغلگیریاں ضائع جارہی ہیں ہم نے بھی ملاقات کے جاپانی آداب اختیار کرلیئے ۔ جاپانی جب بھی کسی شناسا کو دیکھتا ہے تو دو تین گز دور کھڑا ہو جاتا ہے اور ساٹھ درجہ کا زاویہ بنا کر تعظیماً جھک جاتا ہے ۔ گویا کہنا چاہتا ہے کہ بھیا تمھیں دور ہی سے سلام ۔ تعظیماً جھکنے کے آداب کے اور بھی کئی ذیلی آداب ہیں ۔ پتہ چلا کہ ملاقاتی کی عمر اور رتبہ کے لحاظ سے آپ کو جھکنے کے زاویہ کا تعین کرنا پڑتا ہے ۔ کتنی مرتبہ آپ کو جھکنا چاہئیے اس کا انحصار بھی کئی باتوں پر ہوتا ہے ۔ جو شخص جھکنے میں پہل کرتا ہے وہ جتنی مرتبہ جھکے اتنی مرتبہ آپ کو بھی جھکنا پڑتا ہے ۔ ایک بار ہم نے اپنے ایک جاپانی دوست کے آگے جھکنے میں پہل کی تھی ۔ وہ جھکا تو ہمیں احساس ہوا کہ ہمیں اور بھی جھکنا چاہئیے ۔ اب جو ہم دونوں کے بیچ جھکنے کا سلسلہ شروع ہوا تو رکنے کا نام ہی نہ لیتا تھا ۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ایک اور جاپانی دوست نے ہمیں آہستہ سے بتادیا کہ بھیا چونکہ آپ نے جھکنے میں پہل کی ہے اسی لیئے اب اس جھکا جھکی کو روکنے کی ذمہ داری بھی آپ ہی کی ہے ۔ اگر اس نے ہمیں آگاہ نہ کیا ہوتو کیا عجب کہ اب تک ہم ایک جگہ کھڑے جھکتے رہتے ۔ ہم نے تعظیماً جھکنے کے آداب کو تفصیل سے سمجھنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن اس میں چونکہ ہر موقع پر جھکنے کا مختلف زاویہ بنانا پڑتا ہے اسی لیئے ہم اس چکر میں نہیں پڑے کیونکہ جیومیٹری سے ہمیں اپنی طالب علمی کے زمانے سے ہی نفرت ہے ۔

جاپانیوں کی ایک تکلیف دہ ادا تحفے دینے کی ہے ۔ کہیں بھی جائیے ایک عدد تحفہ آپ کی خدمت میں پکڑا دیا جائے گا ۔ پھر ان تحفوں کی پیکنگ اتنی خوبصورت ہوتی ہے کہ اسے کھول کر یہ دیکھنے کو جی نہیں چاہتا کہ اس پردہ زنگاری میں کیا رکھا ہے ۔ ٹوکیو میں ۲۵ دنوں تک تو ہم دونوں ہاتھوں سے خوشی خوشی تحفے قبول کرتے رہے ۔ یہاں تک کہ ہمارا کمرہ تحفوں سے لبالب بھر گیا ہم خود بڑی مشکل سے اپنے کمرے میں داخل ہوتے تھے ۔ ٹوکیو سے واپسی میں جب آٹھ دن رہ گئے تو ہمیں ان تحفوں کی اذیت ناکی کا اندازہ ہوا ۔ ہمیں اچانک یہ خیال آیا کہ ایرلائینس والے تو ہمیں بیس کلوگرام سے زیادہ سامان لے جانے نہ دیں گے ۔ آخر ان تحفوں کا کیا ہوگا جو جاپانیوں نے ہمیں اتنی محبت سے دیئیے ہیں ۔ پوری ایک رات ان تحفوں کے بارے میں سوچتے گزار دی ۔ دوسرے دن ہم نے یونیسکو کی بک ڈیولپمنٹ ڈویژن کی چیف مسز آسانو سے کہا " محترمہ! جاپانیوں کی محبت کی ہم دل سے قدر کرتے ہیں لیکن یہ محبت اب ایرلائینس کے قواعد کے حساب سے کئی کلوگرام وزنی ہوگئی ہے ۔ ہم غریب آدمی ہیں ایرلائینس کو اس زاید محبت کا خرچہ کہاں سے دیں گے ۔ انہوں نے تجویز پیش کی کہ " اب تک جو تحفے ملے ہیں انہیں سمندری جہاز سے بھیج دیجئیے بھاگ دوڑ کر کے اس وقت تک کے سارے تحفے سمندری جہاز کی کمپنی کے حوالے کئے ۔ مگر اس کے بعد تو ہمیں آٹھ دن اور جاپان میں رہنا تھا ۔

ہم نے گڑگڑا کر مسز آسانو سے کہا محترمہ! اب تک جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ خدارا اب جاپانیوں کی محبت کو روکئے۔ ہم سے یہ برداشت نہ ہوگی مگر جاپان میں ہمارا یہ آخری ہفتہ تھا۔ لہذا پارٹیوں، گیشا پارٹیوں اور دعوتوں کا ایک سیلاب سا امڈ آیا۔ ہر دعوت کو قبول کرنے سے پہلے ہم یہ وعدہ لے لیتے کہ ہمیں کوئی تحفہ نہیں دیا جائے گا مگر جاپانی سب کچھ چھوڑ سکتے ہیں اپنی تہذیب کو نہیں چھوڑ سکتے چنانچہ ہر دعوت کے بعد ایک تحفہ ہماری خدمت میں پیش کر دیا جاتا تھا اور ہماری آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ دو ایک دعوتوں میں تو کھانا کھانے کے بعد ہم فوراً بھاگ کھڑے ہوئے کہ تحفے سے نجات پانے کا یہی ایک طریقہ رہ گیا تھا۔ مگر جاپانی ہمارے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے تھے کیونکہ یہ تحفہ بالآخر ہماری ہوٹل پر پہونچ جاتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چھ دنوں بعد ہمیں پھر سمندری جہاز کی کمپنی کی خدمت میں حاضر ہونا پڑا۔

صاحبو! آپ جاپان جائیں تو تحفوں کو اپنے ذہن میں ضرور رکھیں۔ بلکہ ہو سکے تو اپنے ساتھ جاپانیوں کے لئے بھی کچھ تحفے لے جائیں۔ ہم تو کچھ زیادہ تحفے نہیں لے گئے تھے کیونکہ ہمیں جاپانیوں کی عادت کا اندازہ نہیں تھا۔ آپ کو تو ہم نے بتا دیا ہے۔ لہذا زیادہ سے زیادہ تحفے لے جائیے۔ ہو سکے تو کچھ تحفے ہماری طرف سے بھی ان کی خدمت میں پیش کیجئیے۔

جاپانیوں کی ایک اور عادت جوتے اتارنے کی ہے۔ ہر گھر میں داخل

ہونے سے پہلے جوتے اتارنا پڑتا ہے۔ ہر کمرے کے چپل الگ ہوتے ہیں۔
صحن میں جانے کے چپل بھی مختلف ہوتے ہیں۔ جوتوں کے بارے میں ہم
الگ سے مضمون لکھیں گے کیونکہ ہندوستان میں بھی جوتوں کی کچھ کم اہمیت
نہیں ہے۔ پہننے کے سوائے یہ ہر کام آتے ہیں۔ ہمارے یہاں دال تک
جوتوں میں بٹتی ہے۔ ہم نے ایک جاپانی دوست سے پوچھا آپ کے یہاں طرح
طرح کے جوتے اور چپل ہوتے ہیں۔ ہر کمرے کے چپل تک الگ ہوتے ہیں
یہ بتلائیے جلسوں اور مشاعروں میں پھینکے جانے والے جوتے کیسے ہوتے ہیں؟
وہ بہت دیر تک ذہن پر زور دیتا رہا پھر بولا" بھلا جوتے بھی کہیں پھینکنے کی چیز
ہوتے ہیں۔ میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا"

اب ہم اسے اپنی بات کا مطلب سمجھانے کے لئے الگ سے مضمون
لکھیں گے۔ جاپانیوں کو آخر ہم سے بھی تو کچھ سیکھنا چاہئیے۔ چاہے وہ جوتوں کا
استعمال ہی کیوں نہ ہو۔

یونیسکو کی چھتری

وہ ہمیں ٹوکیو میں دوسرے دن ملی اور ہم نے اسی دن اپنی بیوی کو خط لکھا" وہ ہمیں آج ملی ہے۔ دیکھنے میں کچھ خاص نہیں مگر پھر بھی اچھی ہے۔ اب ہمیں اسی کی رفاقت میں ٹوکیو کے شب وروز گزارنے ہیں اور اسی کے سائے میں رہنا ہے" آٹھ دن بعد ہم اپنے ہوٹل میں گہری نیند سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ نیند سے جاگ کر فون کا ریسیور اٹھایا تو پتہ چلا کہ ہندوستان سے فون آیا ہے۔ دوسری طرف سے ہماری بیوی کی آواز آئی تو ہم نے بے ساختہ پوچھا" ہیلو کیسی ہو؟ خیرت سے تو ہونا؟"

ہماری بیوی نے کہا" میری خیریت جائے بھاڑ میں۔ پہلے یہ بتاؤ اس وقت کمرے میں اکیلے ہو یا وہ بھی تمہارے ساتھ ہے"۔

ہم نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا" وہ کون؟ میں تو کمرے میں اکیلا رہتا ہوں۔ کیسی باتیں کرتی ہو۔ میری غریب الوطنی کا تو لحاظ کرو۔ پھر ایسی باتیں کرنے کے لئے کئی سمندر پار سے فون ملانے کی کیا ضرورت ہے"

بولیں" یہ تمہاری آواز میں اتنا خمار کیوں ہے؟ ایک عجیب سی مستی کیوں ہے؟

ہم نے کہا" رات کا ڈیڑھ بجا ہے۔ تمہارے فون کی گھنٹی پر جاگے ہیں۔ گہری نیند میں کیا اتنا خمار اور اتنی مستی بھی نہ آئے گی"۔

بولیں" بالکل غلط۔ اس وقت تورات کے صرف دس ہی بجے ہیں"

ہم نے بات کو کاٹ کر کہا" ٹھیک ہے ہندوستان میں دس بجے ہوں گے مگر یہاں تورات کا ڈیڑھ بجا ہے"

بولیں" مجھے معلوم ہے کہ اب تمہارا وقت اور میرا وقت کبھی نہیں ملے گا۔ مجھے پہلے ہی شبہ تھا۔ تمہارے لہجہ کی سرشاری بتا رہی ہے کہ وہ چنڈال اب بھی تمہارے کمرے میں ہی ہے"۔

ہم نے غصہ سے کہا" یہ کیا مذاق ہے۔ تم کس چنڈال کا ذکر کر رہی ہو۔ جاپان میں کوئی چنڈال ونڈال نہیں رہتی"

بولیں" اب تو تم ادھر ہی کے گن گاوگے۔ اسی لئے تو میں تمہارے جاپان جانے کی مخالف تھی۔ سچ بتاؤ وہ کون ہے جس کے بارے میں تم نے خود اپنے خط میں لکھا ہے کہ وہ تمیں ٹوکیو میں دوسرے ہی دن مل گئی تھی۔ دیکھنے میں کچھ خاص نہیں مگر پھر بھی اچھی ہے۔ اور یہ کہ اب تمہیں اسی کی رفاقت میں ٹوکیو کے شب و روز گزارنے ہیں"

ہم نے زوردار قہقہہ لگا کر کہا" تم سچ مچ بڑی بھولی ہو۔ ٹوکیو میں ہمیں دوسرے دن جو ملی وہ کوئی حسینہ نہیں بلکہ یونیسکو کی چھتری ہے۔ رو میں شاید ہم چھتری لکھنا بھول گئے اور تم نے اس کا رشتہ عورت سے جوڑ لیا"

پوچھا" اچھا تو یہ چھتری ہے؟"

ہم نے کہا "اور کیا؟"

پوچھا "اچھا یہ بتاؤ چھتری شادی شدہ ہے یا غیر شادی شدہ؟"

ہم نے کہا "بھلا چھتریوں کی بھی کہیں شادی ہوتی ہے؟"

بولیں "اس کا مطلب یہ ہوا کہ شادی شدہ نہیں ہے۔ یہ بتاؤ عمر کیا ہے؟"

ہم نے کہا "بڑی پرانی چھتری ہے اس سے پہلے بھی کئی لوگ اسے استعمال کر چکے ہیں؟"

بولیں "اے ہے کچھ تو اپنی عمر کا لحاظ کرو۔ اب تمہیں کون سی غیر مستعملہ چیز ملے گی۔ مرد کی ذات ہی ایسی ہوتی ہے۔ رسی جل جاتی ہے پر بل نہیں جاتا" پھر اپنے لہجے میں غمگینی اور رقت طاری کرتے ہوئے بولیں "خدا کے لئے راہ راست پر آجاؤ۔ تمہاری اولاد اب شادی کے قابل ہو رہی ہے اور تمہیں اب بھی نئی نئی چھتریوں کی تلاش ہے"

ہم نے کہا "تمہارا الزام بالکل غلط ہے یہاں ایسا کوئی سلسلہ نہیں ہے۔ میں نے اپنے خط میں جس کا ذکر کیا ہے وہ سچ مچ چھتری ہے۔ کہو تو تمہارے سر کی قسم کھاتا ہوں جسے میں نے ہمیشہ عزیز رکھا ہے"

بولیں "اچھا تو تم میرے سر کی عزت کرتے ہو۔ تبھی تو میرے سر پر ایک نئی چھتری لا رہے ہو"

یہ کہہ کر ہماری بیوی نے دھڑ سے فون رکھدیا اور ہندوستان سے تھوڑی

دیر کے لئے اچانک جو ہمارا رشتہ قائم ہوگیا تھا وہ ٹوٹ گیا ۔ نیند کوسوں دور بھاگ گئی ۔ ہمیں ہندوستان چھوڑے ہوئے گیارہ دن ہوگئے تھے ۔ کوفت ہوتی رہی کہ یونیسکو کی چھتری نے خواہ مخواہ گڑبڑ کردی ورنہ ہمیں اپنی بیوی سے کتنی اہم اور ضروری باتیں کرنی تھیں ۔ اپنے وطن عزیز کا حال پوچھنا تھا ۔ یہ جاننا تھا کہ ہمارے بغیر ہندوستان کیسا لگ رہا ہے ۔ کیا یہ اب بھی ترقی کر رہا ہے ؟ ہمارے پیچھے سورج وقت پر طلوع ہورہا ہے یا نہیں ۔ ہمارے بغیر کہیں چاند کی روشنی ماند تو نہیں پڑگئی ۔ ان ضروری باتوں کے علاوہ کچھ غیر ضروری باتیں بھی کرنا تھیں ۔ مثلاً ہمارے نکلتے وقت پکوان کی گیس ختم ہوگئی تھی ۔ یہ آئی یا نہیں ۔ ایک دوست کو مٹی کا تیل اکٹھا کر کے پہنچانے کے لئے کہا تھا یہ ملا یا نہیں ۔ بجلی کٹنے والی تھی کٹی یا نہیں ۔ ہم جب چلے تھے تو آندھرا پردیش کے چیف منسٹر کا تقرر زیر تصفیہ تھا ۔ اس کا تصفیہ ہوگیا یا ہماری واپسی کا انتظار کیا جارہا ہے ۔ ایسی ہی کئی باتیں تھیں مگر یونیسکو کی چھتری نے ٹانگ اڑا دی ۔ بیوی پر سخت غصہ بھی آیا کہ محترمہ کی اولاد اب شادی کے قابل ہوگئی ہے لیکن اب تک ہم پر شک کرنے کی عادت نہیں گئی ۔ عورت کی ذات ہی ایسی ہوتی ہے ۔ رسی جل جاتی ہے پر بل نہیں جاتا ۔ اصل غصہ تو اس بات پر تھا کہ اس ٹرنک کال پر کم از کم سو روپیے کا خرچہ تو آہی جائے گا ۔ جو بالآخر ہماری جیب سے ادا ہوگا ۔

نیند اچٹ گئی تو بس اچٹتی ہی چلی گئی۔ گھڑی دیکھی تو تین بج رہے تھے۔ کمرے کی کھڑکی کھولی تو ٹوکیو کی سڑکوں کو بدستور مصروف پایا۔ کھڑکی سے نظر ہٹائی تو میز کے برابر رکھی ہوئی یونیسکو کی وہ چھتری نظر آگئی جو فساد کی اصل جڑ تھی۔

دس دن پہلے ہم یونیسکو کے سیمنار کے افتتاحی اجلاس میں پہونچے تھے تو یونیسکو کی عہدہ دار مس جو نے ہمیں کئی اشیاء دینے کے بعد کہا تھا" میں یہ چھتری بھی آپ کو سونپ رہی ہوں۔ ٹوکیو کا موسم بڑا غیر یقینی ہوتا ہے۔ کسی بھی وقت بارش ہو سکتی ہے۔ اس چھتری کو ہمیشہ اپنے پاس رکھئیے۔ دیگر اشیاء تو اب آپ کی نجی ملکیت بن گئیں۔ لیکن خیال رہے یہ چھتری یونیسکو کی ملکیت ہے۔ جب تک جاپان میں رہیں اسے اپنے پاس رکھئیے اور جاتے ہوئے ہمیں واپس دے جائیے تاکہ یہ یونیسکو کے دیگر سیمناروں میں آنے والے مندوبین کے استعمال میں آسکے"

ہم نے مس جو کے ہاتھ سے چھتری کو لیتے ہوئے کہا" مس جو ہم نے ہمیشہ چھتری کے استعمال سے گریز کیا ہے۔ برسات تو ہمارے پاس بھی ہوتی ہے لیکن ہم بھیگنے کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں یا موقع پاتے ہی دوسرے کی چھتری کے نیچے گھس جاتے ہیں۔ غریب آدمی کی زندگی بہر طور گزر جاتی ہے۔ چھتری کو ہر جگہ اپنے ساتھ ٹنگائے پھرنا ہمیں پسند نہیں۔ چھتری تو پھر چھتری ہے ہم تو

اپنی بیوی کو بھی کبھی اپنے ساتھ لے جانے کے روادار نہیں ہیں"

مس جو نے ہنس کر کہا "۳۵ دن اس چھتری کو اپنے ساتھ رکھئے ۔ ہندوستان جانے کے بعد آپ شاید اپنی بیوی کو چھتری کے نعم البدل کے طور پر رکھنے لگ جائیں گے ۔ عادت اور سنگت بڑی بری چیز ہے"

ہم نے کہا "آگے کا حال ہم نہیں جانتے چونکہ یہ یونیسکو کی ملکیت ہے اسی لئے اس چھتری کی حفاظت کرنے کی پوری کوشش کریں گے ۔ بیوی کی طرح نہیں محبوبہ کی طرح دل و جان سے عزیز رکھیں گے"

یہ پلاسٹک کی چھتری تھی جس کے مٹھ پر گم ٹیپ سے چپکا ہوا ہمارا نام تھا "مسٹر حسین انڈیا" ہوبہو ایسی ہی چھتریاں سمینار کے دیگر مندوبین کے حوالے بھی کی گئیں تھیں ۔ ہم اس چھتری کو لے کر کانفرنس روم میں آئے تو یوں لگا جیسے ہمارے پیروں تلے سے زمین نکلی جارہی ہو ۔ جاپان کے زلزوں کے شہرہ آفاق جھٹکوں سے یہ ہمارا پہلا واسطہ تھا ۔ ہم چھتری چھوڑ کر بھاگنا چاہتے تھے کہ ایک جاپانی دوست نے کہا "زلزلوں کے ایسے جھٹکوں پر یہاں چھتری چھوڑ کر بھاگنا منع ہے ۔ یہ تو روز کا معمول ہے ۔ کب تک آپ بھاگیں گے اور کہاں تک آپ بھاگیں گے" ۔ سمینار کے دیگر مندوبین بھی ہراساں تھے بلکہ سری لنکا کے مندوب مسٹر جیا کوڈی تو اتنے خوفزدہ ہوگئے کہ گھبراہٹ میں اچانک یونیسکو کی چھتری کھول کر کھڑے ہوگئے ۔

زلزلے کا زور تھما تو ہم نے مس جو سے کہا "بی بی! ہمیں آسمان سے آنے والی بلاؤں سے بالکل ڈر نہیں لگتا۔ فلک کج رفتار سے یوں بھی ہماری پرانی آشنائی ہے۔ ہمیں کوئی ایسی چھتری دیجئے جو ہمیں زمین کے نیچے سے آنے والی بلاؤں سے محفوظ رکھ سکے۔ جاپان اتنا ترقی یافتہ ملک ہے آپ نے ایسی چھتری ضرور ایجاد کی ہوگی"

وہ مسکرا کر چلی گئیں تو سری لنکا کے مسٹر جیا کوڈی تھر تھر کانپتے ہوئے ہمارے پاس آئے اور کہنے لگے "مسٹر حسین! میں کل ہی جاپان سے چلا جاؤں گا مجھے ایسا دہلانے والا سمینار نہیں چاہئیے۔ اگر یہ روز کا معمول ہے تو میں یہاں بقیہ دن کیسے گزاروں گا۔ سری لنکا میں میرے دو چھوٹے اور معصوم بچے ہیں۔ ان کی ایک معصوم ماں بھی ہے ان کا کیا ہوگا؟"

ہم نے کہا "مسٹر جیا کوڈی! آپ تو پھر بھی مزے میں ہیں۔ ہمارے تو چار بچے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ آپ کے بچوں کی طرح معصوم نہیں ہیں۔ ایک بیوی ہے جو اتفاق سے معصوم ہے اور پھر اوپر سے یہ یونیسکو کی چھتری بھی اب ہمارے سایۂ عاطفت میں چلی آئی ہے"۔

صاحبو! ہم جاپان کو ذرا دلجمعی اور اطمینان کے ساتھ دیکھنا چاہتے تھے لیکن ہماری یہ خواہش محض اس لئے پوری نہیں ہوئی کہ یونیسکو کی چھتری ہمارے ساتھ تھی۔ محض اس چھتری کی خاطر ہمیں ایک ہی مقام کو دو دو

مرتبہ دیکھنا پڑتا تھا۔ پہلی مرتبہ اس مقام کو دیکھنے جاتے تھے اور دوسری
مرتبہ اس مقام سے اپنی بھولی ہوئی چھتری کو واپس لانے جاتے تھے۔ جاپان
ریڈیو بھی دو مرتبہ گئے۔ ایک مرتبہ اپنا انٹرویو ریکارڈ کرانے اور دوسری مرتبہ
یونیسکو کی چھتری کو واپس لانے کے لئے۔ جاپان کی زنانہ یونیورسٹی میں بھی دو
مرتبہ گئے۔ ایک مرتبہ اپنا خیر مقدم کروانے کے لئے اور دوسری مرتبہ اپنی
چھتری کو واپس لانے کیلئے۔ اگرچہ تھائی لینڈ کی مندوب مس پرینیا کا خیال تھا
کہ ہم جان بوجھ کر زنانہ یونیورسٹی میں اپنی چھتری بھول آئے تھے تاکہ وہاں
ایک بار اور جانے کا بہانہ ہاتھ آسکے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہماری بھول بھی بڑی
سوچی سمجھی ہوتی ہے۔ خیر دنیا کی زبان کو کون روک سکتا ہے اور دنیا نے کب
کس کا بھلا چاہا ہے۔ تاہم اتنا جانتے ہیں کہ زنانہ یونیورسٹی سے اپنی بھولی ہوئی
چھتری کو واپس لانے کے لئے ہم جس قدر خوشی خوشی گئے تھے کہیں اور نہیں
گئے بلکہ دوسری مرتبہ بھی اس چھتری کو وہیں چھوڑے آرہے تھے۔ برا ہو
یونیورسٹی کی عہدہ دار کا کہ ہمارے دبے پاؤں واپس جاتے وقت پکار کر کہا
"مسٹر حسین آپ جس چھتری کو لینے آئے ہیں اسے پھر بھولے جارہے ہیں" ہم
نے بادل نخواستہ عہدیدار کا شکریہ ادا کیا اور راستہ بھر ان کے تیز حافظے کو
کوستے آئے۔ اس چھتری کو ہم کہاں کہاں بھولے اسکا حساب بتانا دشوار ہے۔ ہم
اسے لے کر یوکوہاما گئے، اومیا گئے، نارا گئے، کیوٹو گئے اور ہر جگہ اسے بھولے مگر

یہ پھر بھی ہمیں واپس مل گئی۔ کیوٹو کی ہالی ڈے ان ہوٹل کا کمرہ خالی کر کے ہم باہر نکل آئے۔ کچھ دیر بعد یاد آیا کہ ہماری چھتری تو ہالی ڈے ان میں ہی رہ گئی ہے۔ بھاگم بھاگ واپس گئے تو دیکھا کہ کمرے پر ایک نوجوان جوڑے نے قبضہ کر لیا ہے۔ نوجوانوں کی سرگرمیوں میں خلل ڈال کر اپنی چھتری واپس حاصل کی تو اس لطیفے کی صداقت پر ایمان لانا پڑا کہ ایک بزرگ ہماری ہی طرح اپنی چھتری ہالی ڈے ان کے کمرے میں بھول کر چلے گئے۔ چھتری کو واپس حاصل کرنے کے لئے ہماری ہی طرح واپس آئے تو دیکھا کہ ہنی مون منانے کے لئے آئے ہوئے ایک نوجوان جوڑے نے ان کے سابقہ کمرے پر قبضہ کر لیا ہے۔ چونکہ ہم سے زیادہ سمجھدار تھے۔ اسی لئے کمرے کے دروازے پر کان رکھکر اندازہ لگانے لگے کہ دیکھیں جوڑا کیا کر رہا ہے۔ اس وقت لڑکا لڑکی سے پوچھ رہا تھا "ڈارلنگ! یہ گھنیری زلفیں کس کی ہیں؟"

لڑکی بولی "تمہاری ہیں

"اور یہ ہرنی جیسی آنکھیں کس کی ہیں؟

لڑکی بولی "یہ بھی تمہاری ہیں"

"اور یہ موتی جیسے دانت؟"

لڑکی بولی "یہ بھی تمہارے ہیں"

ان مکالموں کو سن کر بڑے میاں پریشان ہوگئے اور چیخ کر بولے " میاں

برخوردار! جب معاملہ چھتری تک پہونچے تو خیال رہے کہ یہ تمہاری نہیں میری ہے"

صاحبو! اس چھتری سے ہمارے کمزور حافظے کا رشتہ کچھ اتنا استوار ہو گیا تھا کہ آدھی رات کو اچانک نیند سے جاگ کر اس چھتری کو تلاش کرتے تھے ۔ جاپان میں سارے عام مقامات پر چھتریاں رکھنے کے اسٹینڈ ہوتے ہیں ۔ چھتری کو اسٹینڈ میں رکھکر مقفل کیجئیے اور کنجی اپنے ساتھ لیتے جائیے ۔ دو مرتبہ ہم چھتری کے اسٹینڈ کی کنجی بھول گئے ۔ کنجی کو نہ ملنا تھا نہ ملی ۔ بیچارے اسٹینڈ والے کو فاضل کنجی کا سہارا لینا پڑا ۔ غرض اس چھتری نے ہمیں جاپان میں جگہ جگہ رسوا کیا ۔ کسی مقام کی سیر کر کے واپس جانے کے لئے یونیسکو کی بس میں بیٹھتے تو اچانک ہمیں چھتری کی یاد آجاتی تھی اور ہم اسے لینے کو بس سے کود پڑتے تھے ۔ ایک پبلیشنگ کمپنی کا معائنہ کرنے کے بعد ہم بس میں واپس چلے آئے اور معمول کے مطابق پھر چھتری کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے ۔ آدھے گھنٹے کی تلاش کے بعد مایوس ہو کر بس میں خالی ہاتھ لوٹے تو دیکھا کہ چھتری ہماری نشست پر آرام کر رہی ہے ۔ بس ڈرائیور کو بھی ہماری عادت کا اندازہ ہو گیا تھا ۔ بس چلانے سے پہلے پوچھتا تھا ۔ "کیا مسٹر حسین کی چھتری بس میں آگئی ہے" ؟ اثبات میں جواب ملتا تو کہتا" اس کا مطلب یہ ہوا کہ سارے مندوبین بس میں آچکے ہیں"

عوام الناس کی اطلاع کے لئے ہم یہ عرض کرتے چلیں کہ جاپان میں قیام کے دوران میں ہمیں صرف دو منٹ کے لئے اس چھتری کو استعمال کرنے کا موقع ملا تھا۔ غالباً ٹوکیو میں ہماری آمد کا ہی فیض تھا کہ موسم اچانک خوشگوار ہوگیا تھا۔ جاپانی بھی حیران تھے کہ آخر موسم کو کیا ہوگیا ہے۔ ہم ان پر اس راز کو فاش نہیں کرنا چاہتے تھے کہ موسم کی یہ خوشگواری ہماری دین ہے ورنہ وہ ہمیں وہیں روک لیتے۔

ایک دن ذرا سی بوندا باندی ہوئی تو ہم نے کہا چلو آج اس چھتری کو استعمال کر کے دیکھ لیتے ہیں۔ مگر وہ تھی جاپانی چھتری۔ ہم سے کھلنے کا نام نہ لیتی تھی ایک جاپانی کی خدمات حاصل کر کے چھتری کھلوائی لیکن اِدھر چھتری کھلی اور اُدھر برسات رک گئی۔ چار و ناچار دوسرے جاپانی کی خدمات حاصل کر کے چھتری بند کروائی۔

جب اس چھتری کے دوبارہ حصول کے پیچھے ٹیکسیوں اور ٹرینوں میں خاصی رقم خرچ کر چکے اور جاپان کو چھوڑنے میں صرف آٹھ دن باقی رہ گئے تو ایک دن ہم نے چھتریوں کی ایک دکان پر اس چھتری کی قیمت پوچھی۔ پتہ چلا کہ ایک ہزار ین کی ہے۔ اس کے بعد ہم نے اس رقم کو جوڑا جو ہماری غائب دماغی کے باعث اس چھتری پر خرچ ہوئی تھی۔ معلوم ہوا کہ کل پانچ ہزار ین خرچ ہوئے ہیں۔ واضح رہے کہ اس رقم میں اس ٹرنک کال کا سو روپیے کا بل

بھی شامل ہے جسے ہماری بیوی نے اس چھتری سے گھبرا کر ہمیں کیا تھا۔ آدمی کو حساب کے معاملے میں ایماندار رہنا چاہئیے۔

جب سمینار ختم ہوا تو وداعی تقریب کے بعد ہم نے سینہ تان کر بڑے فخر کے ساتھ اس چھتری کو مس جو کے حوالے کیا بلکہ جوش جنون میں فارسی میں یہاں تک کہدیا کہ "سپردم بتو مایہ خویش را"

مس جو نے ہنس کر کہا "مسٹر حسین! اب آپ ہندوستان جا کر اپنی بیوی کو بھی اسی طرح ساتھ رکھیں گے جس طرح یہاں چھتری کو رکھا کرتے تھے

ہم نے کہا "مس جو! اس چھتری کی وجہ سے اب تو ہمیں سچ مچ کسی کو ساتھ رکھنے کی عادت ہو گئی ہے۔ ہم تو کہتے ہیں کہ اس چھتری نے جاپان میں ہمیں اپنی بیوی کی عدم موجودگی کا احساس ہی نہ ہونے دیا۔ یہ اب چھتری نہیں سچ مچ ہماری بیوی بن گئی ہے۔ ذرا دیکھئے تو سہی کہ ہم نے اسے کتنا کم استعمال کیا ہے۔ ۳۵ دن میں صرف ایک بار۔"

مس جو نے ہنستے ہنستے اس چھتری کے مٹھ پر سے گم ٹیپ کو چھیلا اور ہمارا نام نکال دیا۔ ہمارے دل پر ایک بجلی سی گری۔ تڑپ کر بولے "مس جو اس چھتری پر سے ہمارا نام ذرا آہستہ نکالئے۔ دل پر چوٹیں سی پڑ رہی ہیں" اتنا کہنے کے بعد نہ جانے کیوں ہماری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ہمیں ٹوکیو سے ہندوستان واپس آئے ۲۵ دن بیت چکے ہیں لیکن یہ چھتری اب بھی ہمارے ذہن میں کھٹ سے کھل جاتی ہے۔ اگرچہ ہم اسے کھولنا نہیں جانتے تھے۔ نہ جانے کون اس چھتری کو ہمارے ذہن میں کھول دیتا ہے۔ یہ چھتری جو ٹوکیو کے بازاروں میں ہمارے ساتھ رہتی تھی۔ یہ چھتری جس کی مدد سے ہم نے یوکوہاما کے سمندر کی ریت پر نہ جانے کیا کیا شکلیں بنائی تھیں۔ ماونٹ فیوجی کے دامن میں یہ ہماری رفیق تھی۔ جاپان کے دیہاتوں کی گرد اس پر جمی تھی۔ نارا کے پگوڈوں میں یہ ہماری ہم رکاب تھی۔ کیوٹو کے گیشا گھروں میں یہ ایک چشم دید گواہ کے طور پر ہمارے ساتھ تھی۔ اس چھتری کے سائے میں اب کتنی جوان یادیں پل رہی ہیں۔ ہمیں یوں لگتا ہے جیسے ہم جان بوجھ کر اس چھتری کو ٹوکیو میں بھول آئے ہیں کہ اسے لینے کے بہانے پھر ٹوکیو جا سکیں تاکہ جذبوں کے سلسلے پھر جوڑیں۔ یادوں کی کڑیاں پھر ملائیں۔ لمحوں کے موتی پھر پروئیں۔ ارمانوں کے دھاگوں سے پھر نئی نئی داستانیں بنیں۔

اے یونیسکو کی چھتری! ہماری ہمدم! ہماری رفیق اداس نہ ہونا۔ ہم تجھے دوبارہ حاصل کرنے کے لئے پھر آئیں گے۔ ہماری راہوں میں آنکھیں بچھائے رکھنا۔ کیا عجب کہ اب کی بار ہم بادل بن کر تجھ پر برسنے آجائیں۔

بلٹ ٹرین میں کبھی نہ بیٹھو

صاحبو! جب سے جاپان آئے ہیں ہمیں اپنے وطن کی ریل گاڑیاں شدت سے یاد آرہی ہیں ۔ ٹوکیو میں ہماری آوارہ گردی کا واحد ذریعہ جاپانی ٹرینیں ہی ہیں ۔ یوں بھی سارا جاپان ٹرینوں میں بھاگتا پھرتا ہے ۔ ہم بھی ایک ٹرین سے اترتے ہیں تو دوسری میں سوار ہوجاتے ہیں ۔ دوسری سے اترتے ہیں تو تیسری میں گھس جاتے ہیں ۔ اب تو خیر ہمیں ان ٹرینوں میں بیٹھنے کی عادت ہوگئی ہے ۔ ابتداء میں ان میں بیٹھتے ہوئے ڈر لگتا تھا ۔ اس لئے کہ یہ ٹرینیں کسی بھی اسٹیشن پر ایک منٹ سے زیادہ نہیں ٹھہرتیں ۔ ادھر ٹرین رکتی ہے اور ادھر ساری ٹرین کے دروازے خود بخود کھل جاتے ہیں ۔ اترنے والے اتر جاتے ہیں اور ٹرین میں چڑھنے والے چڑھ جاتے ہیں اور پھر دروازے خود بخود بند ہوجاتے ہیں ۔ ہمیں اکثر یہ ڈر ہوتا تھا کہ اگر ہمارا ایک پاوں ڈبے میں اور دوسرا پاوں پلیٹ فارم پر ہو اور ایسے میں ڈبے کا دروازہ خود بخود بند ہوجائے تو ہمارا جو ہونا ہے سو ہوجائے گا مگر ہمارے بال بچوں کا کیا ہوگا ۔ لیکن جاپانی ٹرینیں بڑی سمجھدار ہوتی ہیں ۔ مسافر کا اتنا خیال رکھتی ہیں کہ سفر کرنے کا لطف ہی نہیں آتا ۔ ہم جب تک پوری طرح ڈبے میں داخل نہیں ہوتے تب تک ٹرین کے دروازے بند نہیں ہوتے ۔ ٹوکیو میں زیادہ تر ٹرینیں خانگی

ریلوے کمپنیاں چلاتی ہیں ۔ حکومت کی طرف سے بھی ایک ٹرین چلائی جاتی ہے ۔ لیکن اس میں لوگ ذرا کم ہی بیٹھتے ہیں ۔ کیوں کہ سرکاری ٹرین ہونے کی وجہ سے اس کا کرایہ دوسری ٹرینوں کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے ۔ اور کار گزاری بھی کچھ ایسی ویسی ہی ہوتی ہے ۔ ہر کمپنی کی ٹرین کا رنگ مختلف ہوتا ہے نیلی پیلی لال ہری مٹیالی غرض ہر رنگ کی ٹرین ہوتی ہے ۔ کچھ ریل گاڑیاں زمین کے اوپر چلتی ہیں اور اکثر زمین کے نیچے چلتی ہیں ۔ ٹوکیو زمین کے اوپر جتنا آباد ہے اتنا ہی زمین کے نیچے آباد ہے ۔ کئی بڑے اسٹیشن زمین کے نیچے آباد ہیں

جاپان کی ریل گاڑیاں دنیا کی ترقی یافتہ ریل گاڑیاں سمجھی جاتی ہیں ۔ لیکن پھر بھی ہماری ریل گاڑیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں ۔ ہماری ریل گاڑیوں میں جو سہولتیں دستیاب ہیں وہ جاپانی ریل گاڑیوں میں ہر گز نہیں ہیں مثال کے طور پر ہم اپنے وطن کی گاڑیوں میں اکثر دروازے سے لگے ہوئے ڈنڈے سے لٹک کر سفر کرتے ہیں تو بڑا لطف آتا ہے ۔ یہ سہولت جاپانی ریل گاڑی میں بالکل نہیں ہے ۔ ہم جب بھی ٹرین کا سفر کرتے ہیں تو اپنی بش شرٹ یا پتلون ضرور پھڑوا لیتے ہیں ۔ یہ سہولت بھی جاپانی ٹرین میں نہیں ہے پھر جاپانی ٹرینوں کے مسافر بھی بڑے بد اخلاق ہوتے ہیں ۔ کسی سے کوئی بات نہیں کرتے ۔ بھلا یہ سفر کرنے کا کوئی طریقہ ہوا ۔ ہم جاپانی ٹرینوں میں

پچھلے ایک مہینے سے سفر کر رہے ہیں ۔ کسی مسافر نے پلٹ کر یہ نہیں پوچھا میاں کہاں رہتے ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟ بال بچے کتنے ہیں؟ کتنے بچوں کی شادیاں ہو چکی ہیں؟ آپ کے شہر میں پیاز کا کیا بھاؤ ہے؟ وغیرہ وغیرہ ۔ جاپانی لوگ ٹرین میں سفر کرتے وقت " مون برت " رکھ لیتے ہیں ۔ پلیٹ فارم پر کھڑے کھڑے کتابیں پڑھتے رہتے ہیں ۔ ٹرین آتی ہے تو کتاب میں انگلی رکھ کر ٹرین میں گھس جاتے ہیں اور سیٹ پر بیٹھتے ہی پھر کتاب کھول کر پڑھنے میں لگ جاتے ہیں ۔ ہمیں اکثر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم کسی لائبریری میں بیٹھے ہیں اور لائبریری کے نیچے پہیئے لگا دیئے گئے ہیں ۔ جاپانی یا تو پڑھتے ہیں یا لکھتے ہیں ۔ بات بہت کم کرتے ہیں ۔ انہیں کون سمجھائے کہ میاں ریل گاڑیوں میں لوگ چہرے پڑھتے ہیں ۔ کتابیں نہیں پڑھتے ۔ ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرتے ہیں اور حالات حاضرہ پر تبصرہ کرتے ہیں ۔ جاپانیوں کو سفر کرنا بالکل نہیں آتا ۔ اس معاملے میں یہ ہم سے بہت پیچھے ہیں ۔ صرف آرام دہ ریل گاڑیاں بنانے سے کچھ بھی نہیں ہوتا ۔ سفر کرنے کے کچھ آداب بھی ہوتے ہیں جن سے جاپانی بالکل واقف نہیں ہیں ۔ ہمیں جاپانی ریل گاڑیوں سے یہ شکایت بھی ہے کہ یہ بہت ٹھیک وقت پر چلتی ہیں ۔ انتظار میں جو لذت ہوتی ہے اسکا مزہ جاپانیوں کو کیا معلوم ۔ ایسے ہی کئی معاملات ہیں جن میں جاپانی ہم سے بہت پیچھے ہیں ۔ آپ یقین کریں کہ ہمیں ٹوکیو میں کسی بھی اسٹیشن پر ٹرین کے لئے دو منٹ سے

زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا ۔ ایک ٹرین جاتی ہے تو دوسری اس کے پیچھے آجاتی ہے ۔ اور پھر ان کی رفتار بھی ایسی تیز کہ آدمی کا کلیجہ منہ کو آجائے ۔ پتہ نہیں انہیں کہاں جانے کی جلدی ہوتی ہے ۔ ہماری ریل گاڑیاں اسٹیشن میں داخل ہونے سے پہلے بیرونی سگنل کے پاس ضرور رکتی ہیں ۔ سیٹیاں بجاتی ہیں اور مسافر کھڑکیوں میں سے جھانک جھانک کر سگنل کو دیکھتے ہیں ۔ کتنا مزہ آتا ہے ۔ لگتا ہے جاپانی ریل گاڑیوں کا کوئی سگنل ہی نہیں ہوتا بس منہ اٹھائے کسی بھی اسٹیشن میں گھس جاتی ہیں ۔

ہم نے جاپان کی بلٹ ٹرین کی شہرت بہت سنی تھی ۔ اس میں بھی سفر کر کے دیکھ لیا بالکل واہیات گاڑی ہے ۔ ہمیں بلٹ ٹرین میں بیٹھ کر کیوٹو جانا تھا ۔ یونیسکو کے عہدیدار شنجی تاجما سے کیوٹو کا فاصلہ پوچھا ۔ معلوم ہوا کہ تقریباً پانچ سو کیلو میٹر سے کچھ اوپر کا فاصلہ ہے ۔ اب آدمی اتنے لمبے سفر پر جاتا ہے تو سفر کی تیاریاں بھی کرتا ہے ۔ ہم نے پوچھا اتنا لمبا سفر ہے بستر بند بھی ساتھ رکھ لیں ۔ شنجی تاجما نے ہنس کر کہا " اس میں سونے کی جگہ ہی کہاں ہوتی ہے کہ آپ اپنا بستر لگا سکیں " ۔

پوچھا " راستہ میں پانی کے لئے صراحی یا لوٹا رکھ لیں ؟ "

تاجما نے کہا " پانی آپ کو ٹرین میں مل جائے گا "

پوچھا " اور توشہ دان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟ "

تاجما نے کہا" صبح ناشتہ کر کے ٹوکیو سے چلیں گے دوپہر کا کھانا کیوٹو میں کھالیں گے۔"

ہم نے کہا" یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ہمارے ہاں چھ سو کیلو میٹر کے فاصلے والے سفر کے لئے کم از کم دو وقت کا کھانا، پانی بھری ہوئی ایک صراحی، ایک لوٹا ایک بستر بند اور دو تکیے رکھنا ضروری ہوتا ہے"

شنجی تاجما چونکہ ہندوستان میں ایک سال رہ چکے ہیں اور ہماری ٹرینوں میں سفر کا خاصہ لمبا تجربہ رکھتے ہیں۔اسی لئے شرما کر بولے" مجھے آپ کی مجبوری کا اندازہ ہے۔ہندوستان میں سفر کرنے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔مجھے ایک بار آپ کی ٹرین میں چالیس گھنٹوں تک بیٹھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ان چالیس گھنٹوں میں میرے ساتھی مسافر کی دو صراحیاں ٹوٹی تھیں اور سارے ڈبے میں جل تھل ہوگیا تھا۔ہر اسٹیشن پر اتر کر لوٹوں میں پانی بھرنے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ہماری ٹرینوں میں یہ سہولت نہیں ہوتی۔"

ہمیں بتایا گیا تھا کہ کیوٹو جانے کے لئے ٹوکیو سنٹرل اسٹیشن سے بلٹ ٹرین ٹھیک آٹھ بج کر اکتالیس منٹ پر نکلے گی۔ہم نے سوچا یہ صرف ایک دھونس ہے جو ہم پر جمائی جارہی ہے۔بھلا کونسی ٹرین وقت پر چلتی ہے۔ہم ٹوکیو سنٹرل اسٹیشن پر پہنچے تو ساڑھے آٹھ بج چکے تھے اور بلٹ ٹرین کا دور دور تک کوئی پتہ نہ تھا۔ہم نے تاجما کو چھیڑنے کے انداز میں کہا" حضرت وہ جو بلٹ

ٹرین ۸ بج کر ۴۱ منٹ پر چلنے والی تھی وہ کہاں ہے؟"

تاکماتے نے کہا بس آتی ہی ہوگی۔ ٹھیک آٹھ بج کر پینتیس منٹ پر بلٹ ٹرین پلیٹ فارم پر نمودار ہوئی۔ اس کا انجن طیارے کی شکل کا ہوتا ہے۔ دیکھنے میں بہت خوبصورت ہوتی ہے۔ اس میں سولہ ڈبے لگے ہوتے ہیں۔ ساری ٹرین ایر کنڈیشنڈ ہوتی ہے ہم ٹرین میں داخل ہوئے تو یوں لگا جیسے ہم طیارے میں پہنچ گئے ہیں۔ نشستوں کا انتظام بھی اسی طرح کا ہوتا ہے۔ یہ ٹرین ہانشو جزیرے میں واقع ٹوکیو سے کیوشو میں واقع ہکاتا تک ایک ہزار ستر کیلو میٹر کا فاصلہ تقریباً چھ گھنٹوں میں طئے کرتی ہے۔ یہ دنیا کی سب سے تیز رفتار ٹرین سمجھی جاتی ہے کیوں کہ یہ ایک گھنٹہ میں ۲۱۰ کیلو میٹر کا فاصلہ طے کرتی ہے

ہم ٹرین میں بیٹھے اپنی گھڑی کو دیکھ رہے تھے کہ ٹھیک آٹھ بج کر اکتالیس منٹ پر ٹرین گولی کی طرح اسٹیشن سے نکلی۔ تب ہمیں یقین آیا کہ اس ٹرین کو بلٹ ٹرین کیوں کہتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہر دس منٹ کے بعد ایک بلٹ ٹرین ہاکاتا کے لئے نکلتی ہے۔ ان ٹرینوں کی سب سے بڑی خوبی ان کی پابندی وقت ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ اگر کبھی ٹرین دس منٹ لیٹ ہوجائے تو مسافروں کو سارا کرایہ واپس کردیا جاتا ہے۔ ان ٹرینوں میں آٹومیٹک کنٹرول ہوتا ہے۔ کبھی ٹرین کی رفتار تیز ہوجائے تو ٹرین کو خود بخود

بریک لگ جاتے ہیں۔ جاپان میں زلزلے بہت آتے ہیں۔ جیسے ہی زلزلہ آتا ہے ٹرین خود بخود رک جاتی ہے۔ پٹریوں کی سلامتی کے بارے میں سگنل بھی سیکنڈوں میں ملتے ہیں۔ ہر ٹرین کا ٹیلی فونی ربط ایک دوسرے سے اور ساری ٹرینوں کا ربط ٹوکیو کے سنٹرل اسٹیشن سے ہوتا ہے۔ بلٹ ٹرین سے سفر کرکے ہمیں اس بات کا دکھ ہوا کہ اس میں دھکے نہیں لگتے۔ ٹرین کے چلنے کی آواز بھی اندر سنائی نہیں دیتی۔ دھکے نہ لگنے اور آواز نہ آنے کے باعث اس کی رفتار کا صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا۔ ہمیں بھی اس کی رفتار کے بارے میں شبہ ہوگیا تھا۔ ہمارے دوست نے ہمیں ڈائننگ کار میں لے جاکر ٹرین کا میٹر دکھایا۔ سچ مچ ٹرین ۲۱۰ کیلو میٹر کی رفتار سے چل رہی تھی۔

صاحبو! اگر آپ کو بلٹ ٹرین کے ذریعے ٹوکیو سے کیوٹو جانے کا موقع ملے تو اپنے دل پہ قابو رکھئے۔ اس لئے کہ جاپان کا قدرتی حسن آپ کو مسحور کردے گا بائیں طرف سمندر آپ کے ساتھ ساتھ چلے گا۔ چھوٹے چھوٹے جزیرے نظر آئیں گے اور دائیں طرف فیوجی پہاڑ نظر آتا رہے گا جو وقفہ وقفہ سے بڑا ہوتا جائے گا۔ ٹرین میں سے فیوجی پہاڑ کا نظارہ خود حیران کردینے والا ہوتا ہے۔ آپ کو ناگویا کا شہر بھی ملے گا جو جاپان کا چوتھا بڑا شہر ہے۔ ناگویا کا قلعہ بڑی شہرت رکھتا ہے جو دوسری جنگ عظیم میں برباد ہوگیا تھا۔ اسے ۱۹۵۹ء میں دوبارہ تعمیر کیا گیا۔ تین گھنٹوں کے سفر میں ہم نے جاپان کا جو حسن دیکھا وہ

زندگی بھر ہمارے دل پر نقش رہے گا۔ خدا کرے یہ ہمیشہ ہماری یاداشت کا ایک اثاثہ بنا رہے۔ دوسری جنگ عظیم بھی یاد آئی جس میں اس قدرتی حسن پر بمباری کی گئی تھی۔ ان ہی جگہوں پر کہیں آگ اور بربادی کا ناٹک کھیلا گیا ہوگا پھر ہیروشیما بھی تو یہاں سے پاس ہے۔ انسان جب از سر نو جینے کا اہتمام کرتا ہے تو بربادیوں کے نشان خود بخود مٹ جاتے ہیں۔

بلٹ ٹرین میں ٹیلیفون کی سہولت بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ بلٹ ٹرین میں سفر کرتے کرتے ہم نے اوساکا کو فون کیا اور اردو کے استاد مسٹر اسادہ کو یہ مژدہ سنایا کہ ہم کیوٹو آرہے ہیں۔ ٹرین میں وقفہ وقفہ سے اعلانات ہوتے رہے کہ باہر کا موسم ایسا ہے۔ ہم اتنا فاصلہ طے کر چکے ہیں۔ اب فلاں اسٹیشن آنے والا ہے وغیرہ وغیرہ۔

تقریباً پونے تین گھنٹوں بعد جب ہم کیوٹو پہنچے اور گھڑی دیکھی تو پتہ چلا کہ گاڑی کے پہنچنے کے وقت میں آدھے منٹ کا بھی فرق نہیں ہے۔ ٹوکیو میں بھی ہمیں ایک بار ایک ٹرین سے سگاموا سٹیشن جانا تھا اپنے ایک دوست سے ملنے کے لئے۔ اسٹیشنوں کے نام جاپانی میں لکھے ہوتے ہیں۔ کہیں کہیں انگریزی میں بھی نام لکھے ہوتے ہیں۔ چونکہ ہم اکیلے سفر کر رہے تھے۔ اس لئے ایک صاحب سے سگاموا سٹیشن کی پہچان پوچھی۔ ان صاحب نے کہا ۱۱ بج کر ۳۷ منٹ پر جو بھی اسٹیشن آئے اس پر اتر جائیے۔ وہ سگاموا سٹیشن ہی ہوگا اور

ہم ٹھیک ۱۱ بج کر ۲۷ منٹ پر سگاموا سٹیشن پر موجود تھے۔

بلٹ ٹرین سے اترنے کے بعد ہمارے دوست شنجی تاتماتا نے پوچھا "آپ کا سفر کیسا رہا؟" ہم نے کہا "مسٹر تاتماتا آپ ہندوستان کی ٹرینوں میں سفر کر چکے ہیں۔ ہماری ٹرینوں میں جو سہولتیں ہوتی ہیں وہ آپ کے ہاں کہاں۔ وہ سفر ہی کیا جس میں آدمی کو دھکا نہ لگے۔ ہم نے تین گھنٹے آپ کی ٹرین میں سفر کیا۔ کسی نے ہمارے سر پر صندوق نہیں رکھا۔ کسی کا ہولڈال ہمارے پاوں پر نہیں گرا۔ کسی مسافر نے نشست کے لئے دوسرے مسافر سے لڑائی نہیں کی اور پھر وہ ہرا سٹیشن پر چائے لے لو چائے لو، پان بیڑی سگریٹ والی مانوس آوازیں نہیں سنائی دیں۔ بھلا یہ بھی کوئی ٹرین کا سفر ہے"

تاتماتا نے شرم کے مارے نظر نیچی کر لیں بولے "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں آپ سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ یوں بھی جاپان اور ہندوستان کا کیا مقابلہ۔ ہمارا ملک چھوٹا ہے اور آپ کا ملک عظیم" اور تاتماتا کی یہ بات سن کر ہمارا سر فخر سے اونچا ہو گیا۔

لہٰذا صاحبو! کبھی جاپان جاو تو بلٹ ٹرین میں بالکل نہ بیٹھو۔ بڑی واہیات ٹرین ہے۔ بلٹ ٹرین میں بیٹھنے سے بہتر یہی ہے کہ آدمی ہوائی جہاز میں بیٹھ جائے۔

خموشی گفتگو ہے

شاعر نے کہا ہے عزت اسے ملی جو وطن سے نکل گیا ۔ ہم جب بھی اس مصرعے کو پڑھتے تھے تو سوچتے تھے کہ شاعر کا کام دل کے پھپھولے پھوڑنا ہے ۔ وطن میں لوگوں نے شاعر کے کلام پر داد نہ دی اور بجا طور پر نہ دی تو وطن کے خلاف ہی شعر لکھ مارا ۔ ہم نے اس مصرعے کو شاعر کے دل کی جلن سمجھ کر کوئی اہمیت نہیں دی تھی ۔ مگر جاپان گئے تو احساس ہوا کہ اس مصرعے میں اور کچھ ہو یا نہ ہو صداقت ضرور ہے ۔ اس لئے کہ جب سے جاپان آئے ہیں ہم مصوری آرٹ اور کلچر کے بہت بڑے پارکھ اور ناقد سمجھے جانے لگے ہیں ۔ وطن میں کوئی آرٹسٹ ہمیں منہ نہیں لگاتا ۔ دس گز دور رکھتا ہے کہنے کو تو مقبول فدا حسین جیسے آرٹسٹ سے دوستی ہے بلکہ ان پر ایک عدد خاکہ بھی لکھا ہے ۔ مگر جاپان آتے ہی ہمارا نقشہ بدل گیا ۔ اب آرٹسٹ ہمارے آگے پیچھے گھومتے ہیں اپنی پینٹنگس دکھاتے ہیں اور اپنے آرٹ کے بارے میں ہماری قیمتی رائے کو جاننے کے لئے بیتاب رہتے ہیں ۔ ہمیں بھی اپنی رائے کے قیمتی ہونے کا اندازہ ہے ۔ تب ہی تو کسی کو کوئی رائے نہیں دی ہے ۔ سب سے کہہ رکھا ہے کہ وطن واپس جاکر آپ کے بارے میں رائے لکھ کر بھیجیں گے ۔

وطن والو! تمہیں اس اطلاع سے دکھ ہوگا کہ تم نے جس کے آگے گھاس

نہیں ڈالی وہ جاپان پہنچ کر آرٹ کا بڑا ناقد بن گیا۔ اصل میں خدا جب کسی کو کچھ بنانا چاہتا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے بننے سے روک نہیں سکتی ۔ قصہ صرف اتنا ہے کہ جب ہم جاپان جانے لگے تو ہمارے ایک دوست نے جو انگریزی میں آرٹ کے بہت بڑے ناقد سمجھے جاتے ہیں ۔ ہم سے خواہش کی کہ ہم جاپان سے ان کے لئے جاپان کے بعض مشہور آرٹسٹوں کی پنٹینگس کے پرنٹس لیتے آئیں انہوں نے ہماری سہولت کے لئے جاپانی آرٹسٹوں کے نام اور ان کی پنٹینگس کے عنوانات بھی لکھ دئے تھے ۔ جاپان کے ایک مشہور آرٹسٹ تائی کیان کے بارے میں یہ بھی بتادیا تھا کہ موصوف ہندوستان آئے تھے اور رابندر ناتھ ٹیگور سے ان کی دوستی تھی ۔ ہمیں کیا پتہ تھا کہ ان پنٹینگس کے پرنٹس کو حاصل کرنے کی کوشش میں ہم ایک دن آرٹ کے ناقد اور قدردان بن جائیں گے ۔

ہم نے جاپان پہنچتے ہی یونیسکو کے عہدیداروں کو جاپانی آرٹسٹوں کے نام معہ ان کی پینٹنگ کے عنوانات کے سنانے شروع کردئے ۔ یہ بھی کہا کہ ہمیں ان کے پرنٹس ہر حالت میں چاہئیں ہم نے یہ چالاکی ضرور کی کہ انہیں یہ نہیں بتایا کہ ان پرنٹس کی ضرورت ہمارے ایک دوست کو ہے ۔ جاپانی بیچارے سیدھے سادے ہوتے ہیں دوسرے کی بات پر بھروسہ کرلیتے ہیں ۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ ہم آرٹ کے اور وہ بھی جاپانی آرٹ کے بڑے قدردان

ہیں ہماری شہرت جاپانی آرٹسٹوں میں پھیلی اور وہ ہمارے قدردان بن گئے اور ہم نے ان کی قدردانی کے خوب مزے لوٹے۔

ہم جاپان کے سمائیتما ضلع کے ایک گاوں مشاسی رونزانگ میں پہنچے تو ایک جاپانی دوست نے ہمیں یہ مژدہ سنایا کہ جاپان کا مشہور آرٹسٹ جوڑا مارو کی ایڈی اور مارو کی پوشی یہیں پاس میں رہتے ہیں۔ ان کی پینٹنگس کا میوزیم بھی یہیں ہے۔ مارو کی ایڈی اور مارو کی پوشی دونوں میاں بیوی ہیں۔ دونوں آرٹسٹ ہیں اور دونوں نے زندگی بھر ہیروشیما کی بربادی کو پینٹ کیا ہے۔ ہمیں جب یہ اطلاع ملی تو ہم نے فوراً کہا کہ ہم یہ میوزیم دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہمیں وہاں لے جایا گیا اور ہیروشیما کی تباہی کی پینٹنگس کے سامنے کھڑا کر دیا گیا آپ سے کیا بتائیں کہ ہمارے دل پر کیا گزری۔ ایک ایک پینٹنگ کو دیکھتے تھے تو کلیجہ منہ کو آجاتا تھا۔ مسٹر مارو کی اب ۸۰ برس کے اور مسز مارو کی ۷۰ برس کی ہو گئی ہیں۔ ۱۶/ اگست ۱۹۴۵ء کو جب ہیروشیما پر بم گرایا گیا تو دونوں میاں بیوی ٹوکیو میں تھے۔ بم گرنے کے تیسرے دن یہ پہلی ٹرین سے ہیروشیما گئے۔ جو ان کا آبائی شہر ہے۔ وہاں جو بربادی دیکھی تو فیصلہ کیا کہ زندگی بھر ہیروشیما کی تباہی کی تصویریں بناتے رہیں گے۔ اسی میوزیم کے برابر ان دونوں آرٹسٹوں کی رہائش گاہ بھی ہے۔ اگرچہ یہ میوزیم ایک دیہات میں واقع ہے مگر لوگ ہیں کہ اسے دیکھنے کے لئے دھڑا دھڑ آتے ہیں۔ ہم بھی بڑی دیر

تک اس میوزیم میں لگی تصویروں کے آگے اپنے سر کو ہلا ہلا کر داد دیتے رہے۔
داد دینے سے فرصت ملی تو ہم نے کہا کہ ہم ان دونوں آرٹسٹوں سے ملنا چاہتے ہیں
آرٹسٹوں کو خبر بھجوائی گئی کہ آرٹ کا ایک مشہور ہندوستانی ناقد آپ سے ملنا
چاہتا ہے۔ مسز ماروکی گھر پر موجود تھیں۔ فوراً اپنے گھر کے اندر بلایا۔ بڑی
عزت سے بٹھایا۔ ہم نے ان کی تصویروں کی تعریف کی۔ یہ بھی کہا کہ آپ کی
تصویریں دیکھنے کے بعد ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ی اب ہیروشیما دیکھنے نہیں
جائیں گے (یوں بھی ہمارے دورے میں ہیروشیما جانے کا کوئی پروگرام نہیں
تھا) ہم نے یہ بھی کہا کہ اب زندگی بھر عالمی امن کے لئے کام کرتے رہیں گے۔
وہ بہت خوش ہوئیں اور بولیں "جنگ کی بربادی کے خلاف ہماری یہ ادنی سی
کوشش ہے۔ ہیروشیما پر ایٹم بم کے گرنے سے دو لاکھ ساٹھ ہزار آدمی مرے
تھے۔ مگر ہم اتنی بڑی ٹریجڈی پر صرف نو سو (۹۰۰) تصویریں ہی بنا سکے ہیں۔
اصولاً ہر مرنے والے کی ایک ایک تصویر ہونی چاہیئے تھی۔ مارو کی جوڑا
ہندوستان بھی آچکا ہے۔ دونوں ہندوستان سے بہت محبت کرتے ہیں۔ ان
کے کمرے میں ایک دریا کی تصویر بھی لگی تھی۔ پوچھا "کیا آپ اس دریا کو
پہچانتے ہیں؟" تصویر دیکھی تو چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ یہ کسی بھی دریا کی
تصویر ہو سکتی ہے۔ ہم بھلے ہی آرٹ کے ناقد نہ ہوں چالاک ضرور ہیں۔ ہم نے
کہا "ہمیں تو گنگا دکھائی دیتی ہے" بولیں "آپ نے بالکل ٹھیک پہچانا۔ گنگا کی

شان نرالی ہے ۔ اس کی سج دھج ہی الگ ہے ۔ میں گنگا کو امن کی علامت سمجھتی ہوں"

مسز ماروکی نے بڑی آو بھگت کی ۔ دو گھنٹے اپنے پاس بٹھایا ۔ بعض ہندوستانی آرٹسٹوں کی خیریت پوچھی ۔ ہم نے مسز ماروکی کو نہ صرف ان آرٹسٹوں کی خیریت کی اطلاع دی بلکہ یہ بھی کہا کہ انہوں نے آپ کو سلام پہونچانے کو کہا ہے ۔ مسز ماروکی نے اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر پلائی ۔ ہم جانے لگے تو مسز ماروکی کی آنکھوں میں محبت اور شفقت کے آنسو تھے ۔ بولیں" بہت جلد پھر کہیں نہ کہیں آپ سے ملاقات ہوگی ۔ اپنے حافظہ میں ہمیں محفوظ رکھنا" اتنا سننا تھا کہ ہماری آنکھوں میں بھی عقیدت کے آنسو نکل آئے ۔ اس جاپانی دیہات کی وہ شام ہمیں اب تک یاد ہے ۔ ہیروشیما کی تباہی کی تصویریں بار بار آنکھوں کے آگے گھومتی رہیں ۔ یوں لگا جیسے ہیروشیما میں مرنے والے سب کے سب ہمارے رشتہ دار تھے ۔ اس رات کتنی دیر تک ہم سو نہ سکے ۔ گمان ہونے لگا کہ کہیں ہم سچ مچ آرٹ کے ناقد تو نہیں بن گئے ۔

آرٹ سے ہماری دلچسپی کی اطلاع جاپان میں پھیلی تو دوسرے آرٹسٹ بھی ہم سے ملنے کے لئے بے چین ہونے لگے ۔ ایک ڈنر میں جاپان کے ایک مشہور مصور مسٹر وکانا ایک مترجم کے ہمراہ ہم سے ملنے کے لئے آئے ۔ ہم سے کہا کہ اگر ہم ان کے گھر ایک دن قیام فرمائیں اور ان کی تصویروں کو دیکھیں تو

یہ بات ان کے لئے باعث فخر ہوگی ۔ ہم نے جھوٹ موٹ ہی اپنی مصروفیات کا ذکر کیا اور کہا کہ ہمیں اور بھی کئی آرٹسٹوں سے ملنا ہے ۔ وقت بہت کم ہے پھر بھی چونکہ آپ خاص طور پر آئے ہیں اسی لئے ضرور آئیں گے ۔ معلوم ہوا کہ موصوف ٹوکیو سے ۷۰ کیلو میٹر دور اومیانام کے شہر میں رہتے ہیں ۔ طے یہ ہوا کہ ہم اتوار کو ٹرین سے اومیا پہنچتے ہیں اور وہ اسٹیشن کے مشرقی دروازے پر ہمارے منتظر رہیں ۔ سو ایک اتوار کو ہم مسٹر وکانا سے ملنے اومیا چلے گئے ۔

مسٹر وکانا ہم سے چونکہ ایک مترجم کی مدد سے ملے تھے اسی لئے ہم نے سوچا تھا کہ ہم سے تبادلہ خیال کرنے اور آرٹ کے بارے میں ہمارے زرین خیالات کو جاننے کے لئے وہ مترجم کا بندوبست ضرور کریں گے ۔ پھر اس معاملے میں غرض ان کی تھی ۔ لہٰذا ہم اپنی مترجم کو ساتھ نہیں لے گئے ۔ اومیا پہنچے تو مسٹر وکانا اپنے بال بچوں سمیت دو موٹروں میں ہمارا انتظار کر رہے تھے بہت خوش ہوئے ۔ پھر اشارے سے پوچھا آپ کی مترجم؟ پتہ چلا کہ انہوں نے محض اس خوش فہمی میں کہ ہم اپنی مترجم کو ساتھ لیتے آئیں گے اپنے طور پر مترجم کا بندوبست نہیں کیا ہے ۔ اب وہ جاپانی میں ہم سے کچھ کہتے تھے اور ہم انگریزی میں ان سے نہ جانے کیا کہتے تھے ۔ مسٹر وکانا انگریزی کا ایک ہی جملہ جانتے تھے اور وہ تھا تھینک یو ۔ خیر ہم ان کی انگریزی کے مقابلے میں زیادہ جاپانی جانتے تھے کیوں کہ ہم جاپانی کے پانچ چھ جملے جانتے تھے ۔ ہاتھوں کے

اشارے سے وہ ہمیں کچھ کہتے تھے اور ہم بھی ہاتھوں کے اشارے سے ان کا جواب دیتے تھے ۔ زندگی میں پہلی مرتبہ ہمیں ممکری آرٹسٹ بننے کا شرف حاصل ہوا ۔ ہم نے سوچ لیا کہ اب پورا ایک دن ہماری خموشی گفتگو اور بے زبانی زبان بن جائے گی ۔

مسٹر وکانا نے اشاروں سے اپنے ارکان خاندان کا تعارف کرایا ۔ اشاروں میں رشتوں کا اظہار بہت مشکل ہوتا ہے ۔ لہذا بڑی دیر تک ان کی بیٹی کو ان کی بیوی اور بیوی کو موصوف کی والدہ سمجھتے رہے ۔ زبان کی دشواری کو محسوس کر کے مسٹر وکانا نے اپنی ایک دوست کو فون کیا جن کے بارے میں مسٹر وکانا کو یہ خوش فہمی تھی کہ وہ انگریزی جانتی ہیں ۔ وہ آئیں تو مسٹر وکانا بہت خوش ہوئے ۔ ان سے جاپانی میں کچھ کہا اور خواہش کی کہ وہ ان کی بات ہم تک انگریزی میں پہنچادیں ۔ انہوں نے پوری صدق دلی کے ساتھ انگریزی میں مسٹر وکانا کی بات ہم تک پہنچانے کی کوشش کی مگر ان کی انگریزی اتنی اعلیٰ معیار کی تھی کہ ہم ان کی انگریزی تک اپنی سمجھ کو نہ پہنچا سکے ۔ مسٹر وکانا کی دوست کی انگریزی کی ایک مثال ہم پیش کرنا چاہیں گے ۔ ایک مرحلہ پر انہوں نے ہم سے پوچھا " MR HUSSAIN ! ARE YOU A BIG MAN IN YOUR COUNTRY ?" کیا آپ اپنے ملک کے بڑے آدمی ہیں ؟"

ہم نے حسب استطاعت ان کے سوال کو سمجھ کر پوچھا "ہم نے آپ کی

بات کا مطلب ہنیں سمجھا - اگر بڑے آدمی ہونے سے آپ کا مطلب مالدار آدمی ہونے سے ہے تو ہم قطعاً بڑے آدمی ہنیں ہیں - صرف دو ہزار روپئے ماہوار تنخواہ پاتے ہیں - اگر بڑے آدمی ہونے سے آپ کا مطلب بڑا ادیب ہونے سے ہے تو بے شک ہم اپنے ملک کے بڑے ادیب ہیں - یوں بھی ہمارے ملک میں کوئی چھوٹا ادیب پیدا ہی ہنیں ہوتا"

مسٹر وکانا کی دوست کچھ دیر تک سوچتی رہیں - اپنے ذہن میں جملوں کی صف بندی کرتی رہیں - پھر اپنے ہاتھ کو آسمان کی طرف اٹھا کر بولیں

I want to know whether all Indian are multistoreyed like you?

("کیا سارے ہندوستانی آپ کی طرح کئی منزلہ ہوتے ہیں؟")

تب ہمیں یہ احساس ہوا کہ موصوفہ ہمارے لمبے قد کے حوالے سے یہ جاننا چاہتی ہیں کہ کیا سارے ہندوستانی ہم جیسے لمبے ہوتے ہیں - اس پر ہم نے جواب دیا

No Madam ! some of the buildings are taller than me.

جب مسٹر وکانا کو یہ احساس ہوا کہ ان کی دوست بھی اتنی ہی انگریزی جانتی ہیں جتنی کہ ہم جاپانی تو وہ زبان کی طرف سے مایوس ہو گئے اور سچ مچ

آرٹسٹ بن گئے ۔ اب انہوں نے ہم پر اپنی محبت نچھاور کرنی شروع کردی ۔
دیکھتے ہی دیکھتے سارے خاندان نے روایتی لباس کیمونو پہنا اور ہمیں پکڑ کر
ایک خاص کمرے میں لے گئے پتہ چلا کہ اب چائے پینے کی تقریب ہوگی ۔ مسٹر
وکانا نے اس ساری تقریب کو فلمانے کا پروگرام بنایا اور کیمرہ چلادیا ۔ جاپانیوں
کے ہاں چائے کی تقریب Tea ceremoney کی بڑی اہمیت ہوتی ہے ۔
اس تقریب کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کی عزت کرنا سیکھیں ۔
ایک خاتون نے چائے بنائی اور اسے پیش کرنے کا سلسلہ شروع کیا ۔ چائے
پیش کرنے والی ایک خاص ادا سے آپ کے سامنے چائے کا پیالہ رکھتی ہے اور
زمین بوس ہوجاتی ہے ۔ جس کو چائے پیش کی جارہی ہو اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ
وہ مودبانہ بیٹھا رہے ۔ چائے پینے کے خاص آداب ہوتے ہیں ۔ جن سے ٹانگوں
میں خاصا درد ہوتا ہے ۔ ایک ہی پوز میں گھٹنوں بیٹھ کر اور اپنی ٹانگوں کو خاصی
تکلیف دے کر ہم نے یہ آداب سیکھ لئے تھے ۔

ہمیں مسٹر وکانا کا گھر بہت عالی شان دکھائی دیا ۔ جاپانی گھر بہت چھوٹے
ہوتے ہیں ۔ لیکن ان کا گھر کافی وسیع اور کشادہ تھا ۔ گھر کے ہر گوشے سے ٹپکتا تھا
کہ ایک آرٹسٹ کا گھر ہے ۔ چائے کی تقریب کے بعد مسٹر وکانا ہمیں اسٹوڈیو
میں لے گئے اور ایک کے بعد ایک پنٹینگ ہمارے سامنے رکھنے لگے ۔ جس
محبت کے ساتھ وہ پنٹینگوں کو ہمارے سامنے رکھتے تھے اس سے ان کا خلوص

ٹپکتا تھا۔ ان کی کئی پنٹینگس کو دیکھنے کے بعد ہم نے ان کی دوست سے کہا "مسٹر وکانا کی خوبی یہ ہے کہ وہ انسانی آنکھ کو ایک نئے ڈھنگ سے پیش کرتے ہیں۔ ہر تصویر میں آنکھوں کا زاویہ مختلف ہوتا ہے۔ اور ان کی ادا الگ ہوتی ہے" ہماری رائے کو جاپانی میں سن کر مسٹر وکانا پھڑک اٹھے اور اپنی دوست کی معرفت جواب دیا "مجھے بڑی خوشی ہے کہ آپ نے میری مصّوری کی روح کو پہچان لیا" اس دن پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اگر ہم آرٹ کے ناقد بننا چاہیں تو بن سکتے ہیں۔

مسٹر وکانا کی پنٹینگس کے ذریعہ اپنی نظروں کو سرور عطا کر کے ہم ڈرائنگ روم میں واپس آئے تو ان کا سارا خاندان ہمارا منتظر تھا۔ ہم ابھی بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ پانچ سال کی ایک چھوٹی سی لڑکی نے ہمیں کاغذ سے بنا ہوا ایک سارس دیا۔ پتہ چلا کہ لڑکی نے ہمارے لئے بطور خاص بنایا ہے۔ ہم نے اس کے گال تھپتھپائے تو وہ کاغذ لے کر ایک اور سارس بنانے میں مصروف ہوگئی۔ ہم چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کی فنکاری میں گم ہوگئے۔ اتنی چھوٹی سی لڑکی اور ہاتھ کی یہ صفائی۔ مسٹر وکانا کا سارا خاندان فنکاروں کا خاندان ہے بیوی مجسمے بناتی ہیں۔ نواسی کاغذ کے پرندے بناتی ہے۔ لڑکا بھی تصویریں بناتا ہے۔

ہم نے پورا ایک دن زبان کو زحمت دیئے بغیر مسٹر وکانا کے گھر گزار دیا

اس دن ایک عجیب و غریب احساس یہ ہوا کہ بعض صورتوں میں زبان ترسیل کا ذریعہ نہیں بلکہ ترسیل میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔

مسز وکانا نے رنگوں اور خطوط کی زبان کے ذریعہ ہم سے اتنا کچھ کہہ دیا کہ اگر ہم جواب میں اپنی زبان کا استعمال کرتے تو وہ لڑکھڑا جاتی۔

ہم جانے لگے تو مسز وکانا اپنے ارکان خاندان کے ساتھ ہمیں چھوڑنے کیلئے اومیا اسٹیشن پر آئے۔ انہوں نے صرف تھینک یو کہا کیوں کہ وہ اتنی ہی انگریزی جانتے تھے اور ہم نے صرف "دوموآری گاتو گزائی مس" کہا کیوں کہ ہم اتنی ہی جاپانی جانتے تھے۔ ان کی نواسی کچھ نہیں جانتی تھی۔ سو ہم جانے لگے تو اس نے دوڑ کر ایک اور خوبصورت سارس ہمارے حوالے کر دیا۔ یہ سارس اب بھی س ہمارے پاس محفوظ ہے۔ ہم جب بھی اس سارس کو دیکھتے ہیں تو لگتا ہے کہ اس کے س سامنے دنیا کی ساری زبانیں ہیچ ہیں۔ اس سارس میں معنی و مفہوم کے جتنے سمندر چھپے ہوئے ہیں ان کا احاطہ کرنے کی سکت دنیا کی کسی زبان میں نہیں ہے۔ یہ سارس اب بھی اپنے پنکھ کھولے سدا ہماری یادوں میں اڑتا پھرتا ہے۔

جاپان میں اسلام

جاپان کے ایک مشہور پبلشر ہیں ۔ ہیروشی ایماموراً ۔ ایک بار ہمیں
اپنے گھر کھانے پر مدعو کیا تو جیسا کہ ہماری عادت ہے ان سے انواع واقسام کے
سوالات پوچھنے لگے ۔ ان سے پوچھا "آپ کا مذہب کیا ہے ؟" بولے " میں عیسائی
ہوں " ان کی بیوی کے مذہب کے بارے میں پوچھا تو اپنی اہلیہ کو باورچی خانہ
سے طلب کر کے پوچھا " تمہارا مذہب کیا ہے ؟" ہماری جستجو اور بے تکے سوالات
کے باعث مسٹر ایماموراکو پہلی بار پتہ چلا کہ ان کی اہلیہ محترمہ کا مذہب کیا ہے
اگر ہم ان کے گھر نہ جاتے تو خود اپنی گھریلو زندگی کے بارے میں ان کی
معلومات میں اتنا اضافہ کیونکر ہوتا ۔ ہمارے تجسس کو مہمیز لگ چکی تھی ۔
لہذا ہم نے لگے ہاتھوں ان کی لڑکی کے مذہب کے بارے میں پوچھا تو کچھ دیر اپنی
پیشانی پر سے پسینہ پونچھتے رہے ۔ اس مشکل سوال کا جواب معلوم کرنے کے
لئے اپنی بیوی کو پھر باورچی خانہ میں سے طلب کرنا چاہتے ہی تھے کہ ہم نے کہا
" اب رہنے بھی دیجئیے ۔ ان کا بھی کوئی اچھا سا مذہب ہوگا " ان کے ہاں ایک
نوجوان لڑکی بیٹھی ہوئی تھی ۔ اس سے پوچھا " اور آپ کا مذہب ؟ "

اس نے اچانک اپنی بائیں آنکھ کی پتلی کو نیچے کیا اور دائیں آنکھ کی پتلی
کو اوپر لے جا کر کچھ سوچنے لگی (جاپانی لڑکیاں ہر مشکل سوال کے جواب میں بھی

حرکت کرتی ہیں ۔ بہت بھلی لگتی ہیں) ۔ اسی لئے ہم ہمیشہ ان سے مشکل سوالات ہی پوچھا کرتے تھے ۔ کچھ دیر سوچ کر اپنے کندھوں کو ایک دم نیچے گراتی ہوئی بولی "عجیب سوال ہے! میں نے ابھی تک اس بارے میں کوئی فیصلہ ہنیں کیا ہے ۔ جب مذہب کی ضرورت لاحق ہوگی تو تب سوچا جائے گا"

مسٹر ایما مورا نے لڑکی کی مشکل کو بھانپ کر کہا "اصل میں ہمارے ہاں مذہب ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے ۔ ہمارا قدیم مذہب شنٹو کہلاتا ہے ۔ پھر جاپان میں بودھ مت پھیلا ۔ مگر بودھ مت اختیار کرنے کے باوجود اب بھی بدھ مت کے ماننے والے شنٹو مندروں میں جاتے ہیں اور شنٹو مذہب کے ماننے والے بودھ مندروں مین جاتے ہیں ۔ پتہ ہنیں کون سے خدا سے کب کام پڑ جائے" ۔

ان حالات میں یہ کیسے ممکن تھا کہ ہم وہاں جاکر اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں کچھ نہ پوچھتے ۔ ہمارا مسئلہ صرف اتنا تھا کہ جاپان میں قیام کے دوران بقرعید آنے والی تھی اور ہم عید کی نماز بہت پابندی سے پڑھتے ہیں ۔ دو چار دوستوں سے پوچھا تو پتہ چلا کہ پورے جاپان میں دو مسجدیں ہیں ۔ ایک مسجد تو خود ٹوکیو میں واقع ہے اور دوسری مسجد جاپان کے شہر کوبے میں موجود ہے ۔ یہ دونوں مسجدیں ترکی کے خلیفہ نے کئی برس پہلے بنائی تھیں ۔ چنانچہ ان دونوں مسجدوں کی دیکھ بھال بھی حکومت ترکی کرتی ہے اور ان کے امام

بھی حکومت ترکی کی طرف سے مقرر کئے جاتے ہیں۔ جن دنوں ہم ٹوکیو میں تھے وہاں کی ترکی مسجد کے پرانے امام واپس جاچکے تھے اور نئے امام کے تقرر کا انتظار کیا جارہا تھا۔

ایک دن یونیسکو کے دفتر میں انڈونیشیا کے بین الاقوامی شہرت یافتہ ادیب آیپ روسیڈی(AJIP ROSIDI) اوران کی بیوی سے ملاقات ہوئی۔ آیپ روسیڈی کی تحریروں کا ترجمہ دنیا کی تقریباً ساری زبانوں میں ہوچکا ہے۔ ہندی میں بھی ان کی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ اتفاق سے وہ جمعہ کا دن تھا۔ ہم سے کہنے لگے "آپ تو مسلمان ہیں۔ جمعہ کی نماز پڑھتے ہوں گے۔"

ہم نے یونہی کہہ دیا "پڑھتے تو ہیں لیکن ٹوکیو میں کہاں پڑھیں؟"

بولے "میں اور میری بیوی جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے جاپان اسلامک کانگریس کی مسجد کو جارہے ہیں جو شنجوکو میں واقع ہے۔ آپ بھی ساتھ چلیں"

ہم نے کہا "سمینار کا وقفہ دو گھنٹوں کا رہتا ہے اتنی دیر میں شنجوکو جانا اور پھر واپس آنا ممکن نہ ہوگا پھر ہمیں دوپہر کا کھانا بھی کھانا ہے"

بولے "میری گاڑی میں چلئیے۔ رہی کھانے کی بات تو وہاں نماز کے بعد نمازیوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے"

ہمارے برابر سری لنکا کے مندوب مسٹر جیاکوڈی کھڑے تھے۔ انہوں نے کھانے کی بات سنی تو پوچھا "کیا مفت کھانا کھلایا جاتا ہے؟"۔

آیپ روسیڈی بولے "ہاں! جاپان اسلامک کانگریس کی طرف سے کھلایا جاتا ہے"۔

اس پر جیاکوڈی بولے "ایسی بات ہے تو میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں" جیا کوڈی ویسے تو بدھ مت کے ماننے والے ہیں۔ لیکن کھانے کی بات سن کر ہمارے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئے۔ کسی نے سچ کہا ہے پیٹ بڑا بدکار ہے۔

ہم آیپ روسڈی کی گاڑی میں جانب مسجد روانہ ہوئے تو باتوں باتوں میں آیپ روسڈی نے بتایا کہ اگرچہ ٹوکیو میں ترکیوں کی بھی ایک مسجد ہے لیکن وہاں کے امام صاحب غائب ہیں۔ اب جاپان اسلامک کانگریس نے شنجوکو میں جو ٹوکیو کا سب سے خوبصورت علاقہ ہے وہاں عارضی طور پر ایک مسجد قائم کرلی ہے۔ اس کے علاوہ اسلامک کانگریس نے اس علاقہ میں ایک عالیشان مسجد تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جس کے بارے میں دعوی کیا جاتا ہے کہ یہ دنیا کی سب سے بڑی مسجد ہوگی۔

ہم نے کہا "مگر اتنی بڑی مسجد کے لئے نمازی کہاں سے آئیں گے؟"

بولے "آپ چل کر اسلامک کانگریس کی سرگرمیوں کو تو دیکھ لیجیے۔ تب پتہ چلے گا"

ٹوکیو بھول بھلیوں کا شہر ہے۔ پھر شنجوکو تو وہاں کا سب سے مصروف علاقہ ہے۔ آیپ روسیڈی اس مسجد میں کئی بار آچکے ہیں لیکن اس کے باوجود

وہاں پہنچ کر وہ راستہ بھٹک گئے ۔ گاڑی پارک کرنے کے بعد ہم مسجد کا راستہ تلاش کر ہی رہے تھے کہ ایک نوجوان لڑکی نے ہمارے چہرے پر عبادت کے نور کو بھانپ کر ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں پوچھا "کیا آپ مسجد کی تلاش میں ہیں ؟" ہم نے ہاں میں جواب دیا تو بولی " السلام علیکم آپ میرے ساتھ چلیں ۔ میں بھی جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے جارہی ہوں " راستہ میں ایک اور جاپانی لڑکی السلام علیکم " کہہ کر ہمارے ساتھ چلنے لگی ۔ جاپان اسلامک کانگریس کی مسجد پانچویں منزل پر ہے لہذا ہمیں لفٹ میں سوار ہو کر مسجد میں جانا پڑا ۔ جاپان اسلامک کانگریس کے صدر پروفیسر ڈاکٹر شوقی فتاکی نماز کی تیاریوں میں مصروف تھے ۔ ہمیں دیکھتے ہی زوردار مصافحہ کیا ۔ پوچھا "آپ کہاں سے آرہے ہیں ؟ " ہم نے جب بتایا کہ ہندوستان سے آئے ہیں تو بہت خوش ہوئے ۔ اپنے ساتھی ڈاکٹر عبدالسلام موریتا سے ملایا ۔ نماز کی تیاری ہو رہی تھی ۔ لوگ وضو کر رہے تھے ۔ ہم نے بھی وضو کیا ۔ وضو کرنے کا ایسا معقول انتظام ہم نے ہندوستان کی کسی مسجد میں نہیں دیکھا ۔ نمازیوں میں مردوں اور خواتین کی تعداد تقریباً برابر تھی اور دلچسپ بات یہ تھی کہ ان میں اکثریت نوجوانوں کی تھی ۔ خواتین اور مرد ایک ساتھ نماز پڑھتے ہیں ۔ خواتین کی صفیں الگ ہوتی ہیں ۔ چار پانچ عرب باشندے بھی نماز میں شریک تھے ۔ خطبہ جاپانی میں ہوا اور نماز اسی طرح پڑھائی گئی جس طرح ہم یہاں پڑھتے ہیں ۔

نماز کے بعد کئی جاپانی مسلمانوں اور جاپان اسلامک کانگریس کے عہدیداروں سے ملاقات ہوئی ۔ آئیے ذرا جاپان اسلامک کانگریس کا کچھ حال بیان ہوجائے ۔ جاپان اسلامک کانگریس کا قیام دسمبر ۱۹۷۴ء میں ہوا جب جاپان کے مشہور ڈاکٹر پروفیسر شوقی فتاکی نے اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ اسلام قبول کیا اور جاپان اسلامک کانگریس کی داغ بیل ڈالی ۔ ہمیں بتایا گیا کہ جب جاپان اسلامک کانگریس کا قیام عمل میں آیا تو جاپان میں مسلمانوں کی تعداد بڑی مشکل سے پانچ ہزار تھی اور اب ان کی تعداد ۶۰ ہزار کے لگ بھگ ہوگئی ہے ۔ ہمیں جاپان اسلامک کانگریس کی سرگرمیوں کو دیکھ کر یہ یقین ہو چلا ہے کہ یہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائے گی ۔ کیونکہ اسلامک کانگریس نے جاپان میں اسلام کی ترویج واشاعت کے لئے ایک عملی پروگرام بنایا ہے ۔

ڈاکٹر شوقی فتاکی پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں ۔ دوسری جنگ عظیم میں بھی کئی کارنامے انجام دے چکے ہیں ۔ انہوں نے اسلامی دواخانوں کے قیام کے ذریعہ تبلیغ کا پروگرام بنایا ہے ۔ پہلے اسلامی میڈیکل کلینک کو اپریل ۱۹۷۶ء میں حکومت نے تسلیم کیا ۔ اس کلینک میں روزآنہ ۱۳۰ میڈیکل آفیسرس ۸۰۰ سے زیادہ مسلم مریضوں کا علاج کرتے ہیں ۔ ایسے اسلامی کلینک سارے جاپان میں قائم کئے جارہے ہیں ۔ ان کلینکوں کی جانب سے مسلم ممالک کو وفود بھی بھیجے جاتے ہیں ۔ حج کے موقع پر بھی جاپانی ڈاکٹروں کی ایک ٹیم سعودی

عرب جاتی ہے۔ ۱۹۷۵ء سے جاپان اسلامک کانگریس نے عربی زبان کی تعلیم کا بندوبست بھی کیا ہے اس کے علاوہ قرآن کی تعلیمات کے بارے میں ایک اسٹڈی سرکل بھی قائم کر چکا ہے۔ جس کے ہفتے میں دو اجلاس ہوتے ہیں ایک پان عرب نیوز ایجنسی بھی قائم کی گئی ہے جس کے ذریعہ اسلامی ممالک کی تازہ خبریں فراہم کی جاتی ہیں۔

ہمیں جاپان اسلامک کانگریس اور عرب نیوز ایجنسی کے دفتر میں تین چار مرتبہ جانے کا اتفاق ہوا۔ بہت سلیقہ اور منصوبہ بندی کے ساتھ یہ دونوں ادارے کام کرتے ہیں۔

ڈاکٹر فنائی اسلامی میڈیکل کلینک کی دیکھ بھال کرنے کے علاوہ جاپان اسلامک کانگریس کے سارے امور کی نگرانی کرتے ہیں۔ دنیا کے سارے اسلامی ممالک کا دورہ کر چکے ہیں۔ عموماً جمعہ کے دن جاپانیوں کو مسلمان بنایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر شوقی فنائی جاپان کے صنعت کاروں بیوپاریوں اور سیاستدانوں میں اسلام کو عام کرنے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ جاپان کی بڑی ہوٹلوں میں "اسلامی عشائیہ" کا اہتمام کیا جاتا ہے جن میں جاپان کی سر کردہ شخصیتوں کو مدعو کیا جاتا ہے۔ انہی کوششوں کے نتیجہ میں جاپان کے ممتاز سیاستداں اور جاپان کے سابق وزیر مواصلات محمد کومی یاما نے ۲۱ دسمبر ۱۹۷۸ کو اسلام قبول کیا۔ اس وقت جاپان کی پارلیمنٹ کے تین ارکان بھی مسلمان

ہیں ۔ جاپان کے کراٹا چمپین نے بھی اسلام قبول کر کے اپنا نام احمد رکھ لیا ہے مسلمانوں کے کراٹا گروپ بھی الگ قائم ہیں ۔ ڈاکٹر شوقی فتاکی یہ چاہتے ہیں کہ جاپان میں مسلمانوں کی تعداد پچاس لاکھ ہو جائے اور اس طرح اسلامی طرز زندگی کی جھلک جاپان کی عام زندگی میں دکھائی دینے لگے ۔

اسلام کی اشاعت کے اس منظم پروگرام کے بعد کچھ حلقوں کے جانب سے جاپان اسلامک کانگریس کی سرگرمیوں کی مخالفت بھی شروع کی گئی ۔ جو ڈاکٹر اسلامی میڈیکل کلینکوں میں کام کر رہے ہیں ان کے خلاف ٹوکیو میڈیکل ہلت بیورو نے کارروائی شروع کی اور انہیں تنگ کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا ۔ اس کے خلاف جاپان اسلامک کانگریس نے جہاد کا اعلان کیا اور جاپانی عدالتوں میں ٹوکیو میڈیکل ہلت بیورو کے احکام کو چیلنج کیا گیا اور بالاخر جاپان اسلامک کانگریس کے حق میں ہی فیصلہ ہوا ۔

جاپان اسلامک کانگریس کی موجودہ مسجد میڈیکل کلینک شنجوکو کے برابر ہی قائم ہے ۔ جس میں ہر جمعہ کو تقریبا ساڑھے تین سو مسلمان نماز ادا کرتے ہیں ۔ شنجوکو میں ایک عظیم الشان مسجد کی تعمیر کا کام بھی شروع کیا گیا ہے ۔ یہ مسجد نو ہزار مربع میٹر کے رقبہ پر پھیلی ہوئی ہوگی جس میں بیک وقت پانچ ہزار مسلمان نماز ادا کر سکیں گے ۔

جاپان اسلامک کانگریس نے پچھلے سات برسوں میں جو کام انجام دئیے

ہیں وہ حیرت انگیز ہیں ۔ جس تیزی سے جاپانی نوجوان مسلمان بن رہے ہیں وہ بھی حیرت انگیز ہے ۔

ایک دن ہم نے جاپان اسلامک کانگریس کے ایک عہدیدار سے باتوں باتوں میں کہا "حضرت جاپان کی معیشت کا سارا دارومدار عربوں کے تیل پر ہے ۔ جو جاپانی اشیاء ساری دنیا میں اپنا ڈنکا پیٹتی پھر رہی ہیں انہیں بنانے والی فیکٹریاں سب تیل کی مدد سے چلتی ہیں ۔ آپ کے ہاں تیل نام کی کوئی چیز نہیں ہے یہ جو ٹوکیو راتوں کو جگمگاتا ہے یہ سب تیل کی کرامات ہیں ۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ عربوں کے تیل کے حصول کے لئے جاپان میں اسلام اس قدر تیزی سے فروغ پارہا ہو ۔ یوں بھی اب یہی ایک ایسا مذہب ہے جس کا تیل نکالا جاسکتا ہے "

وہ بولے " لاحول ولاقوۃ آپ کیسی باتیں کرتے ہیں ۔ ہم تو ہر شئے باہر سے درآمد کرتے ہیں ہمارے پاس کوئی قدرتی وسائل نہیں ہیں ۔ لوہا بھی آپ کے ملک سے منگاتے ہیں ۔ تیل عرب ممالک سے منگاتے ہیں ۔ ہماری تو صرف فیکٹریاں چلتی ہیں اور محض اس لئے چلتی ہیں کہ ہم محنت کرنا جانتے ہیں ۔ ہم خام مال درآمد کرتے ہیں اور تیار مال برآمد کرتے ہیں ۔ ہم عربوں سے تیل بھی اسی قیمت پر لیتے ہیں جس قیمت پر دوسرے ممالک لیتے ہیں "

ہم ان سے مزید کچھ پوچھنا چاہتے تھے کہ اذان کی آواز آئی اور وہ نماز کے

لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

جاپان اسلامک کانگریس کی سرگرمیوں نے سچ مچ بہت متاثر کیا۔ ہمیں بتایا گیا کہ اسلام کی تبلیغ کے لئے ایک حیدرآبادی کی خدمات سے بھی جاپان اسلامک کانگریس نے استفادہ کیا تھا۔ ہم نے ان کا نام جاننے کی کوشش کی مگر پتہ نہ چل سکا۔ کبھی آپ جاپان جائیں تو اسلامک کانگریس کے دفتر ضرور جائیں، ہم احتیاطاً پتہ لکھے دے رہے ہیں۔

JAPAN ISLAMIC CONGRESS

4F, 6TH ARAI BUILDING

1 - 5 - 4 KABUKICHO

SHINJUKU - KU

TOKYO - 160 (JAPAN)

ٹوکیو کے بازاروں میں

بازار چاہے دہلی کے ہوں یا ٹوکیو کے ان سے ہمارا کوئی رشتہ آج تک قائم نہ ہو سکا۔

دنیا میں ہوں دنیا کا طلبگار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں

ٹوکیو کے بازار دنیا بھر کی چیزوں سے بھرے پڑے ہیں ۔ بہت سی چیزوں کے بارے میں تو ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ کس کام آتی ہیں اور ان کے خریدار کون ہیں ۔ یوں بھی ٹوکیو میں ہمیں جاپانیوں کی محبت اور خلوص کے سوائے کچھ نہیں خریدنا تھا ۔ کیوں کہ یہی وہ شئے ہے جس پر وطن عزیز میں کسٹم والے کوئی ڈیوٹی نہیں لگاتے ۔ وہ لاکھ تلاشی لیں مگر ہمارے دل میں چھپی ہوئی محبت کی دولت کو کہاں پکڑ سکتے ہیں ۔ پھر سو باتوں کی ایک بات یہ کہ دن بھر میں تین وقت کا کھانا خریدنے کے بعد ہماری جیب میں کوئی اور چیز خریدنے کی گنجائش کہاں باقی رہتی تھی ۔ البتہ ایک چیز ہم جاپان میں ضرور خریدنا چاہتے تھے اور وہ ہے ہمارا لباس ۔ جاپان جاتے ہوئے ہم بڑی مشکل سے کپڑوں کے تین جوڑے لے گئے تھے ۔ سوچا تھا جاپان جاکر اپنے لئے بڑھیا کپڑے خریدیں گے بلکہ ہم تو کپڑوں کا ایک ہی جوڑا لے جانے والے تھے ۔ مگر

خدا بھلا کرے ہماری اہلیہ محترمہ کا کہ انہوں نے زبردستی دو پرانے جوڑے مزید ہمارے سامان میں رکھ دئیے ۔ اب جو جاپان جاکر ہم نے ٹوکیو کے بازاروں میں اپنے لئے کپڑے تلاش کرنے شروع کئے تو پتہ چلا کہ ان کے کپڑوں میں اتنی سکت نہیں ہے کہ وہ ہمیں اپنے اندر سمو سکیں ۔ جاپانیوں کا قد بہت چھوٹا ہوتا ہے اسی لئے وہ اپنے حساب سے کپڑے تیار کرتے ہیں ۔ کوئی پتلون کمر میں صحیح آتی تو پائینچے چھوٹے ہوجاتے اور پائینچے صحیح ہوتے تو پتلون کمر میں تنگ ہوجاتی تھی ۔ یہی حال شرٹس کا بھی ہوا ۔ ٹوکیو کا چپہ چپہ چھان مارا ۔ ہمیں اپنے سائز کے کپڑے نہ ملے لوگوں نے کہا کپڑا خرید کر سلوا لیجئیے ۔ ہم اس خیال سے متفق بھی ہوگئے لیکن اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے احتیاطاً سلائی کے دام پوچھے تو پتہ چلا کہ کپڑے کے دام سے دس گنا زیادہ ہونگے ۔ ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور کے بارے میں پتہ چلا کہ وہاں امریکیوں کی سائز کے کپڑے ملتے ہیں ہم وہاں بھی گئے کپڑے سائز کے مطابق نکلے لیکن جاپانیوں نے ان تیار کپڑوں کے دام امریکیوں کی معاشی خوشحالی کے حساب سے رکھے تھے ۔ یوں کپڑوں کی طرف سے ایسے مایوس ہوئے کہ چار وناچار اپنے تین پرانے جوڑوں پر ہی جاپان میں اپنے قیام کو نپٹایا ۔ رات میں چوری سے اپنے ہوٹل میں کپڑے کا ایک جوڑا دھوتے تھے اور دوسرے دن خود اپنے ہاتھوں ان پر استری پھیر لیتے تھے ۔ جاپان جانے کے بعد ہی ہم نے کپڑوں پر استری کرنے کا

گر سیکھا۔ صاحبو! اگر آپ کا قد پانچ فٹ دس انچ اور آپ کا وزن ۷۰ کیلو گرام ہے اور اس کے باوجود اگر آپ کو جاپان جانے کا موقع ملے تو اپنے کپڑے اپنے ساتھ لے جائیے پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی ۔ اس معاملے میں جاپانیوں پر بالکل بھروسہ مت کیجئیے۔

جب ہمیں احساس ہوگیا کہ ہم جاپان کے بازاروں سے کچھ نہیں خرید سکتے تو ہم ان بازاروں میں بے دھڑک گھومنے لگے اسی لئے ہم جاپان کے بازاروں کے بارے میں اور لوگوں کے مقابلے میں زیادہ جانتے ہیں ۔ ہم ہر شام جاپان کے بازاروں میں کھو جاتے تھے ۔ ہمارا ریلوے پاس اکھیا بارا کے اسٹیشن پر ختم ہوتا تھا اور اکھیا بارا نہ صرف ٹوکیو بلکہ سارے جاپان کا سب سے بڑا الکٹرانک اشیا کا بازار ہے ۔ وہ الکٹرانک اشیا جن سے جاپان ساری دنیا میں جانا اور پہچانا جاتا ہے وہ یہاں فروخت ہوتی ہیں ۔ ایک سے ایک عالیشان دکان ہے جن میں انواع واقسام کے ریڈیو ، ٹرانزسٹر ۔ ٹیلی ویژن ۔ کیالیکولیٹرس ، واکی ٹاکی ، گھڑیاں اور کیمرے فروخت ہوتے ہیں ۔ لوگ سبزیوں کی طرح الکٹرانک اشیاء خریدتے ہیں ۔ یہاں جاکر ہمیں جاپانیوں کی عظمت کا احساس بھی ہوتا تھا اور ان پر ترس بھی آتا تھا ۔ مانا کہ جاپان الکٹرانک اشیاء کی تیاری کے مقابلے میں اس وقت دنیا میں سب سے آگے ہے ۔ دنیا بھر میں اس کی سیکو اور سٹی زن گھڑیاں ، نیشنل پیناسونک ریڈیو ، ہٹاچی اور سونی کے

ٹرانزسٹروں، لیشیکا کے کیمروں، ٹویوٹا اور ڈٹسن کی موٹروں کی دھوم ہے۔ مگر دنیا والوں کو جاپان کے ادیبوں، فنکاروں اور آرٹسٹوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم۔ جاپان کے باہر کوئی انکے نام نہیں جانتا۔ جاپان کے ادب آرٹ اور کلچر کو بنانے والے ٹرانسٹروں، گھڑیوں، کیمروں اور موٹروں کے نیچے دب گئے ہیں۔ ہم نے کئی جاپانی فنکاروں سے مذاق مذاق میں کہا، میاں! چیزیں ضرور بناو مگر اتنی اچھی بھی نہ بناو کہ تم پس پشت چلے جاو۔ چیزیں جاپان کی شناخت کا حصہ ضرور بنیں۔ مگر تم بھی تو جاپان کی شناخت کا حصہ بنو۔ ہم بھی چیزیں بناتے ہیں مگر یہ ہم سے زیادہ مقبول نہیں ہیں۔ بھلے ہی ہمارے ٹرانزسٹروں، کیمروں اور موٹروں کو کوئی نہ پوچھتا ہو مگر ہمارے کالیداس، کبیر، میرابائی۔ امیر خسرو۔ غالب، میر، رابندر ناتھ ٹیگور اور ڈاکٹر اقبال کو ساری دنیا جانتی ہے۔ جاپانی فنکار ہماری بات کو مذاق میں ٹال دیتے تھے۔ ہو گی کوئی مصلحت ان کی۔ صاحبو! ان سب باتوں کے باوجود ٹوکیو جاو تو اکھیا بارا ضرور جاو۔ بشرطیکہ آپ اپنی عقل کو دنگ اور زبان کو گنگ کرنا چاہیں۔ یہاں قدیم جاپان کی جھلک اب بھی دکھائی دیتی ہے۔ جاپانی خواتین اور مرد اب بھی جاپان کے روایتی لباس کیمونو میں دکھائی دیتے ہیں۔ کیمونو پہننے کے بعد جاپانی عورت کی چال میں عجیب سی طرحداری پیدا ہو جاتی ہے جو قدموں کو ناپ ناپ کر رکھنے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ علاقہ ٹوکیو کے دیگر علاقوں سے بالکل مختلف ہے۔

یہاں کے بازاروں کی سجاوٹ بھی روایتی ہے ۔ اساکسا میں ہی آپ کو جاپان کی گیشا لڑکیاں دکھائی دیں گی ۔ ویسے اب گیشا لڑکیاں کم سے کم ہوتی جارہی ہیں ۔ زمانہ جو ترقی کر رہا ہے ۔ ہم نے جتنی بھی گیشا لڑکیاں دیکھیں وہ سب کی سب ۳۵ برس سے زیادہ کی تھیں ۔ آپ کو ان کی عمروں سے کیا لینا دینا ۔ آپ تو بس ٹوکیو کے چاندنی چوک یعنی اساکسا کو دیکھنے جائیے اور قدیم جاپان کی ایک جھلک دیکھ کر آجائیے ۔ مگر ذرا جلدی کیجئیے ۔ کہیں یہ جھلک ختم نہ ہوجائے ۔ کیا کریں زمانہ جو ترقی کر رہا ہے ۔

اساکسا میں ہی کنین کا مشہور بودھ مندر ہے جو ساتویں صدی عیسوی میں بنایا گیا تھا ۔ لکڑی کا بنا ہوا ہے مگر اس کی طرز تعمیر آپ کو حیرت میں ڈال دے گی وہ چودھویں کے چاند کی رات تھی جب ہم اس مندر کو دیکھنے گئے تھے ۔ لوگ دھڑا دھڑ اس مندر میں عبادت کے لئے آرہے تھے اور دونوں ہاتھ جوڑ کر مندر کے آگے کھڑے ہوجاتے تھے ۔ پوجا کا یہ طریقہ ہمیں خالص ہندوستانی لگا جاپان کے دو بڑے مذہب ہیں ۔ بودھ مت اور شنٹو مت ہیں ۔ شنٹو مت جاپان کا قدیم مذہب ہے ۔ مگر عموماً سارے جاپانی دونوں مذاہب پر یقین رکھتے ہیں شادی شنٹو مندر میں کرتے ہیں تو ان کی آخری رسومات بودھ مت کے عقیدوں کے مطابق انجام پاتی ہیں ۔ ایک جاپانی دوست نے ہمیں بتایا تھا کہ بھیا! ہم تو کاروباری آدمی ہیں دونوں مذہبوں پر یقین رکھتے ہیں ۔ پتہ نہیں کب

کونسے خدا سے کام پڑ جائے ۔

ٹوکیو کے سب سے مشہور علاقے دو ہیں ۔ ایک کا نام گنزہ ہے اور دوسرے کا شنجوکو ۔ گنزہ کو جاپان کا شوکیس کہا جاتا ہے ۔ دکانوں کی سجاوٹ، بازاروں کی رونق روشنیوں کی جگمگاہٹ، انسانوں کی ریل پیل، گنزہ کو چاندی کی طرح چمکدار بنادیتی ہے ۔یوں بھی جاپانی میں گنزہ چاندی کو کہتے ہیں ۔ یہاں جاپان کے سب سے عالیشان تھیٹر، سنیما گھر، ریستوران اور دکانیں آباد ہیں ۔ یہیں کے ایک کابکی تھیٹر میں ہم نے ایک کابکی شو بھی دیکھا تھا " کابکی " کو موسیقی ریز ڈرامہ کہہ لیجئیے ۔اس میں قصور کابکی کا نہیں بلکہ ہمارا تھا کہ یہ ہمیں پسند نہیں آیا ۔ یہاں کی ایک ہندوستانی ریستوران میں ہم نے اپنے جاپانی دوستوں کو کھانے پر بلایا تھا ۔ (ریستوران کا نام نہیں بتائیں گے کیونکہ ہم وطنوں کی برائی کرنا دیش سے غداری ہے) بیرے سر پر پگڑی باندھے کارٹون بنے پھرتے ہیں ۔ مگر بعد میں گاہکوں کی پگڑی اچھالتے ہیں ۔ بہت دنوں سے بریانی نہیں کھائی تھی سو بریانی منگائی، قورمہ تو ہر کوئی کھاتا ہے ۔ہم چھ دوست تھے ۔ جانے لگے تو لتا منگیشکر کے ایک فلمی گیت کی مدھر دھن کی آڑ میں بیرے نے ہم سے ہنستے ہنستے بیس ہزار ین وصول کرلیئے ۔

صاحبو! اپنے دیش کا کھانا اپنے ہی دیش میں اچھا لگتا ہے ۔ بعد میں ہم ٹوکیو کے اور بھی کئی علاقوں کے ہندوستانی ریستورانوں میں گئے ۔ کھانا کھانے کیلئے

ہنیں بلکہ ان کا مائیلٹ استعمال کرنے اور لتا منگیشکر یا محمد رفیع کا گیت سننے۔ ایشیائی ثقافتی مرکز کے ڈائریکٹر مسٹر یما کا ہمیں اکثر گنزہ لیجاتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ جاپان کے شرفا کا علاقہ ہے۔ مگر چند دنوں بعد ہمارے نوجوان دوست شنجی تاکماتے نے ہمیں طعنہ دیا کہ جو لوگ بوڑھے ہو جاتے ہیں وہ مجبوراً شریف بن جاتے ہیں۔ آپ تو خدا کے فضل سے ابھی اتنے بوڑھے ہنیں ہوئے کہ اپنی مرادوں کی شامیں گنزہ میں برباد کریں۔ میرے ساتھ شنجوکو چلئیے۔ جہاں جاپان کے نوجوانوں کی شامیں گزرتی ہیں۔ ہم فوراً سینگ کٹا کر بچھڑوں میں جا ملے جیسا کہ ہماری عادت ہے اور پھر اس کے بعد جتنے دن ٹوکیو میں رہے اپنے وجود سے شنجوکو کی شاموں کو روشن اور معطر کرتے رہے ہائے وہ شنجوکو کی شامیں۔ لفظوں میں اتنی سکت کہاں کہ وہ ان شاموں کو اپنی باہنوں میں سمیٹ سکیں روشنی میں ہناتے ہوئے تر و تازہ بدن، نوجوانوں کے بہکتے قدم، ان کی سرگوشیاں، ان کی بے نیازیاں، سچ جانئیے ہم تو ان شاموں سے یوں گزرتے تھے جیسے کوئی گہری نیند میں کسی اچھوتے خواب سے گزر جاتا ہے۔ ہمارے بزرگ دوست مسٹر یما کا نے پھر شرفا کے علاقے کا حوالہ دے کر ہمیں گنزہ لیجانا چاہا مگر ہم نے صاف کہہ دیا کہ اگلی بار اگر ٹوکیو آنا ہوا تو انشاء اللہ گنزہ میں ضرور اپنی شامیں گزاریں گے۔ اور عمر رفتہ کو آواز دیں گے۔ مگر اب تو شنجوکو کی شامیں ہمیں آواز دے رہی ہیں۔ للہ ہمیں نہ روکئیے۔ ہر چراغ گل ہونے سے

پہلے بھڑکتا ہے سو ہمیں بھی بھڑکنے دیجئے ۔ شام ہوتے ہی ہم اپنے نوجوان جاپانی دوستوں کے ساتھ شنجوکو کی باہنوں میں پہونچ جاتے تھے ۔

شنجوکو میں ٹوکیو کی کئی بلند عمارتیں ہیں ۔ ساری عمارتیں زلزلہ پروف ہیں ۔ زلزلہ آئے تو یہ اسی طرح ہلتی ہیں جس طرح تیز ہوا میں پیڑ ہلتے ہیں ۔ مگر زلزلہ تھمتے ہی پھر اپنی اصلی حالت میں آجاتی ہیں ۔ ہمیں شنجوکو کی نومرا بلڈنگ بہت پسند تھی جس کی پچاسویں منزل پر شیشے کا گھر تھا ۔ اس بلڈنگ کی لفٹ اتنی تیز رفتار ہے کہ آدھے منٹ میں پچاسویں منزل پر پہونچا دیتی ہے ۔ ہم سرِشام شیشے کے اس گھر میں جاکر بیٹھ جاتے تھے ۔ چاروں طرف دور دور تک ٹوکیو ہی ٹوکیو دکھائی دیتا ہے ۔ ہمیں یہ بلڈنگ اس لئے بھی پسند تھی کہ یہاں سے فیوجی پہاڑ کا نظارہ بڑا دلفریب معلوم ہوتا ہے ۔ ویسے تو فیوجی پہاڑ ٹوکیو سے ڈھائی تین سو کلو میٹر دور ہے مگر نومرا بلڈنگ کے اس شیشہ گھر میں بیٹھے بیٹھے اکثر ہمارا جی چاہتا تھا کہ ہم شیشہ گھر کی کھڑکی سے باہر ہاتھ نکال کر فیوجی پہاڑ کے سر پر سے اس برفانی ٹوپی کو اچک لیں جو پہاڑ کا طرہ امتیاز ہے ۔ ہم گھنٹوں فیوجی پہاڑ کو گھورتے رہتے تھے ۔ پھر جب رات کا اندھیرا اترنے لگتا اور فیوجی پہاڑ کی برفانی ٹوپی دھندلی ہونے لگتی تو ہم اپنی نظروں کو وہاں سے ہٹا کر ٹوکیو کی جگمگاتی اور دوڑتی بھاگتی سڑکوں پر ڈال دیتے تھے ۔ لاکھوں موٹریں اور ہزاروں ٹرینیں نہ جانے کہاں بھاگی پھرتی ہیں ۔ انہیں کیا پتہ کہ ایک پردیسی نومرا

بلڈنگ کی پچاسویں منزل پر بیٹھا ان کی بھاگ دوڑ کا مزہ لے رہا ہے۔

درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغِ رہ گزر کو کیا خبر ہے

ٹوکیو کی آخری شام بھی ہم نے نومرا بلڈنگ کے شیشہ گھر میں گزاری تھی۔ فیوجی پہاڑ کو ہم نے اس شام اس قدر گھورا کہ ہمیں یقین ہے کہ اس کی ٹوپی کی برف ضرور پگھل گئی ہوگی۔ اس کی برفانی ٹوپی پگھلی ہو یا نہ ہو، ہم تو پگھل گئے تھے اور اپنی ہی آنکھوں سے آنسو بن کر ٹپک گئے تھے۔ کچھ یادیں ہی ایسی ہوتی ہیں جو دل سے ابھر کر آنکھوں سے چھلک جاتی ہیں۔

صاحبو! ہم تو خواہ مخواہ سنجیدہ ہو گئے۔ خود بھی رنجور ہوئے۔ آپ کو بھی ملول کیا۔ آپ کو فیوجی پہاڑ کی برفانی ٹوپی سے اور ہماری یادوں سے کیا مطلب۔ بس اتنی گزارش ہے کہ کبھی ٹوکیو جانا ہو تو نومرا بلڈنگ کی پچاسویں منزل پر ضرور جانا۔ ہماری آنکھوں سے فیوجی پہاڑ کو دیکھنا، وہاں کے کافی ہاؤس میں ہمارے ہونٹوں سے چائے پینا۔ ہمارے ہاتھوں سے شیشہ گھر کی ریلنگ کو ضرور چھونا۔ وہیں کہیں ہمارا اور ہمارے دوستوں کا لمس بھی ہوگا۔ یہ سب کرنا مت بھولنا۔ سمجھ گئے نا۔ تو پھر رہا وعدہ۔

حرف آخر

صاحبو! جب ہم لکھنے پر آتے ہیں تو لکھتے ہی چلے جاتے ہیں ۔ چاہے کوئی ہمارے لکھے کو پڑھے یا نہ پڑھے ۔ جاپان کے سفر کے دوران میں ہم پر جو کچھ بیتی اس کا حال لکھ لکھ کر روزنامہ "سیاست" حیدرآباد کو بھیجتے رہے ۔ اس کتاب میں آپ نے اب تک جو تحریریں پڑھی ہیں یہ اسی دور کی یادگار ہیں جب ہم جاپان کے بارے میں لکھنے کے سوائے کچھ اور لکھنے کے اہل ہی نہیں تھے ۔ اس سفرنامہ کی اکثر قسطیں (بشرطیکہ اسے سفرنامہ کہا جاسکے) ہم نے جاپان کے قیام کے دوران میں ہی لکھی تھیں ۔ کچھ قسطیں ہندوستان واپس آکر لکھیں سوچا تھا کہ ذرا اطمینان سے اور جی لگا کے جاپان کے بارے میں مزید کچھ لکھیں گے مگر وطن عزیز میں "اطمینان" کہاں اور "جی کو لگانا" کیسا؟

برادر عزیز نصیر احمد صاحب، مالک حسامی بک ڈپو کا جب اصرار بڑھا کہ ان مضامین کو کتابی شکل میں چھپنا چاہئیے تو ہم نے اپنے لکھے ہوئے ان مضامین کو نہ صرف یکجا کیا بلکہ پڑھا بھی ۔ ماشاء اللہ اچھے مضامین ہیں ۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ مگر ان مضامین میں وہی کوتاہی ہے جو ہماری تحریر کا وصف خاص ہے ۔ یعنے غیر اہم اور غیر ضروری باتوں کا ذکر کچھ زیادہ ہو گیا ہے ۔ اہم اور کام کی باتیں رہ گئی ہیں ۔ اب اسے کیا کیجئیے کہ ہم خود اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ

لوگ ہماری تحریروں کو پسند ہی اس لئے کرتے ہیں کہ ان میں کام کی باتیں نہیں ہوتیں ۔ اب اگر ہم بھی مفید اور کام کی باتیں کرنے لگ جائیں تو بیچارے دوسرے ادیب کیا کریں گے ۔ تاہم اس حرف آخر کو لکھنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ ہم بھی جی کڑا کر کے کچھ کام کی باتیں کریں تاکہ ناقد حضرات کو یہ موقع نہ ملے کہ اس سفرنامہ کو "ادب برائے ادب" کے زمرے میں شامل کرلیں ۔

صاحبو! حکومت ہند نے ہمیں اپنے نمائندے کی حیثیت سے پانچ ہفتوں کے لئے جاپان کو اس لئے روانہ کیا تھا کہ وہاں یونیسکو کی طرف سے منعقد ہونے والے پبلیشنگ کے سمینار اور تربیتی کورس میں حصہ لیں ۔ اس سمینار کا اس سفر میں کہیں کوئی ذکر نہیں ہے ۔ اس معاملہ میں ہم جان بوجھ کر خاموش رہے ۔ حکومت نے اگر ہمیں طباعت اور اشاعت کا ماہر جانا تو اس میں قصور ہمارا نہیں حکومت کا تھا ۔ بھلے ہی حکومت نہ جانے مگر ہم تو اپنی صلاحیتوں کو جانتے ہیں ۔ پبلشنگ سے ہمارا تعلق صرف اتنا ہے کہ اب تک ہماری تصنیف کردہ آٹھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں (یہ اور بات ہے کہ ان کتابوں کی اشاعت کا اہتمام بھی دوسرے اداروں نے کیا ہے) تاہم اس خصوص میں اتنے قصوروار ضرور ہیں کہ چھ سال تک ایک پرنٹنگ پریس کے منیجر رہ چکے ہیں اور ان دنوں اتفاق سے ایک اشاعتی ادارے سے وابستہ ہیں ۔ پبلیشنگ کے معاملہ میں اس محدود تجربہ کی روشنی میں یہ ناممکن تھا کہ ہم ایک بین الاقوامی سمینار میں

جاتے اور وہاں اپنی علمیت کا ڈنکا نہ پٹواتے ۔ لہذا سمینار کے پہلے دن ہی ہم نے ہندوستان میں کتابوں کی اشاعت کے تعلق سے ایک ایسا بصیرت افروز، معلومات افزا، اور خیال انگیز مقالہ پڑھا کہ سمینار کے منتظمین نہ صرف عش عش کر اٹھے بلکہ اپنی اپنی انگلیاں اپنے اپنے دانتوں میں دبالیں (اس سے ہمیں پتہ چلا کہ جاپان میں بھی دانتوں میں انگلی دبانے کا طریقہ رائج ہے) پہلے دن تو ہم بہت خوش ہوئے کہ ہم نے اپنی علمیت اور مہارت کی دھاک بٹھادی اور اپنے ملک کا نام روشن کیا جس کی خاطر ہمیں جاپان بھیجا گیا تھا۔ لیکن دوسرے دن سے جب جاپانی پبلیشروں نے بڑی کسر نفسی اور خجالت کے ساتھ (جیسا کہ ان کی عادت ہے) پبلیشنگ کے میدان میں اپنی حقیر اور کمترین کاوشوں کا ذکر شروع کیا تو پورے ایک مہینہ تک ہمیں اپنی انگشت شہادت کو دانتوں تلے دبائے رکھنا پڑا۔

صاحبو! اگر ہم نے اس سمینار کا تفصیل سے ذکر نہیں کیا تو اس کی وجہ صرف اتنی تھی کہ ہم اپنے احساس کمتری پر قابو نہ پاسکے ۔ سارے ایشیا میں جاپانی سب سے زیادہ "پڑھاکو" قوم ہے اور دنیا بھر میں ان کے اشاعتی کاروبار کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے ۔ ہم نے محسوس کیا کہ جاپانی یا تو لکھتا ہے یا پڑھتا ہے باتیں کم کرتا ہے ۔ جہاں جائیے لوگ کتابیں خریدنے اور پڑھنے میں مصروف رہتے ہیں ۔ ٹوکیو میں ایک محلہ ہے "کندا" جو شہنشاہ جاپان کے محل سے

متصل ہے ۔ اس میں ہر طرف کتابیں فروخت ہوتی ہیں ۔ کتابوں کی اتنی بڑی دکانیں ہم نے کہیں نہیں دیکھیں ۔ ہوٹلوں اور تفریح گاہوں میں بھی کتابوں کی فروخت کا انتظام موجود ہے ۔ کتاب خریدنے والوں کو اپنے علم کی پیاس بجھانے کے لئے بہت دور جانا نہیں پڑتا ۔ جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی ۔ چار پانچ سال کی عمر کے بچے بھی بڑے ذوق وشوق سے کتابیں نہ صرف خریدتے ہیں بلکہ انہیں پڑھتے بھی ہیں ۔ جاپان کی آبادی تقریباً ساڑھے گیارہ کروڑ ہے اور سال بھر میں تقریباً ۸۰ کروڑ کتابیں فروخت ہوتی ہیں ۔ گویا ہر جاپانی سال بھر میں ساڑھے چھ کتابیں ضرور خریدتا ہے (ایک ہم ہیں کہ پڑھنے لکھنے کے معاملے میں اتنی شہرت رکھنے کے باوجود پچھلے تین برسوں میں ہم نے کوئی کتاب نہیں خریدی ۔ ہاں ادیب دوستوں کی کتابوں کے اعزازی نسخے ضرور قبول کرتے ہیں اور انہیں پڑھے بغیر ردی میں بیچ دیتے ہیں) بہر حال کچھ ایسے ہی عجیب وغریب احساسات تھے کہ جن کے باعث ہم نے سیمینار کے ذکر کو گول کر دیا ۔

ایک شخصیت کا ذکر بھی اس سفر نامہ میں تفصیل کا طلبگار تھا مگر ہم اس شخصیت کے سلسلے میں بھی انجان ہی رہے ۔ محض یہ سوچ کر کہ ان کا ذکر ان کے شایان شان لکھیں گے ۔ یہ شخصیت ہے مسٹر ریوجی ایٹوکی جو یونیسکو کے ایشیائی ثقافتی مرکز کے ڈائرکٹر جنرل ہیں ۔ جاپانیوں کی عمر کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے ۔ تاہم ہمارے اندازے کے مطابق یہ ۷۰ سال کے تو ہونگے ہی ۔

مگر دل ان کا نوجوانوں کی طرح دھڑکتا اور دماغ تو جوانوں کی طرح سوچتا ہے۔ انہیں ہر "ایشیائی چیز" سے پیار ہے۔ مگر وہ ہمیں "ایشیائی چیز" سے کچھ زیادہ ہی سمجھتے تھے اور ضرورت سے کچھ زیادہ ہی ہمیں عزیز رکھتے تھے۔ نہ جانے ہماری کونسی ادا انہیں بھا گئی تھی۔ ہندوستان سے جاتے ہوئے ہم ان کے لئے چند گھٹیا سے تحفے لے گئے تھے ان تحفوں کو پاکر وہ کچھ اس قدر نہال ہوئے کہ ہم سمینار میں شرکت کے لئے پہنچتے تھے تو اکثر ہماری کرسی پر ان کی طرف سے ہمارے لئے کوئی تحفہ رکھا ہوتا تھا جس پر مسٹر ریوجی ایٹو کی دستخط شدہ تحریر ہوتی تھی FOR YOU MR. HUSSAIN.

سمینار میں وہ بہت کم آتے تھے مگر بسا اوقات اپنی سکریٹری کو بھیج کر ہمیں اپنے کمرے میں طلب کرتے تھے۔ اگرچہ ہم کیوٹو کے ایک گیشا گھر کی سیر کر چکے تھے۔ لیکن مسٹر ریوجی ایٹو کی عنایت سے ہمیں ٹوکیو کے ایک گیشا گھر میں بھی جانے کا موقع ملا۔ ٹوکیو میں وہ ہماری آخری رات تھی۔ مسٹر ریوجی ایٹو ہمیں ایک گیشا پارٹی میں لے گئے۔ وہ رات اب بھی ہمارے ذہن میں محفوظ ہے۔ ریوجی ایٹو نے گیشاؤں کو نہ جانے کیا اشارہ کر دیا کہ وہ ہماری خاطر تواضع ضرورت سے کچھ زیادہ ہی کرنے لگیں یہاں تک کہ کھانا بھی اپنے نرم و نازک ہاتھوں سے کھلایا۔ ہم آلتی پالتی مارے ان کے سامنے بیٹھے رہے۔ ہمیں سگریٹ کو جلانے تک کی اجازت نہیں تھی۔ کیوں کہ ہم جب بھی سگریٹ

جلانا چاہتے تو گیشا آگے بڑھ کر اس سگریٹ کو جلادیتی تھی ۔ رات بھیگ گئی تو گیشاوں نے مرکیاں لے لے کر گانا شروع کیا ۔ گانا تو خیر ہماری سمجھ میں کیا آتا ۔ ریوجی ایتو کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگایا کہ ان بیبیوں کا گانا اچھا ہی ہوگا ۔ گیشائیں گانے سے فارغ ہوچکیں تو اصرار کرنے لگیں کہ ہم بھی اپنے وطن کا کوئی گانا سنائیں ۔

صاحبو! آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ جاپان میں ہمیں گلوکار کی حیثیت سے خاصی شہرت مل چکی تھی ۔ وطن میں کسی کو ہماری اس خداداد صلاحیت کی طرف دھیان دینے کی توفیق نہیں ہوئی ۔ جاپان کے اکثر ریستورانوں میں گانے کا انتظام ہوتا ہے ۔ ایک گھنٹے تک ریستوران کے گلوکار اور موسیقار گانا گاتے ہیں ۔ اس کے بعد گاہکوں کو موقع دیا جاتا ہے کہ وہ بھی سنانا چاہیں تو سنادیں ۔ جاپان میں ہماری آمد کے آٹھ دن بعد ایک رات ریستوران میں کھانا کھارہے تھے کہ ایک جاپانی دوست نے خواہش کی کہ ہم بھی کوئی ہندوستانی گانا سنائیں ۔ اب جو ہم نے گانا گایا تو پتہ چلا کہ ہندوستانی موسیقی کے اصل قدردان تو جاپان میں ہی موجود ہیں ۔ ہم سے کئی گانے سنے گئے ہمیں اتنی داد ملی کہ محمد رفیع اور مکیش کو کیا ملی ہوگی ۔ جاپانیوں نے ہمیں سر آنکھوں پر بٹھایا ۔ ہم سے پوچھا گیا کہ ہم نے موسیقی کی باضابطہ تعلیم کس سے حاصل کی ہے اور کتنے برس تک اس میں ریاض کیا ہے ؟ موسیقی کی باضابطہ

تعلیم کے سلسلے میں ہم نے نہ جانے کس استاد کا ذکر کیا تھا اب ٹھیک سے یاد نہیں رہا۔ غالباً بڑے غلام علی خان کا حوالہ دیا تھا۔ کیوں کہ موسیقی کے سلسلے میں ہمیں یہی ایک نام معلوم ہے۔ جاپان میں بھلا کون جانچ پڑتال کرنے والا تھا۔ جہاں تک ریاض کا سوال ہے ہم نے یہ ضرور کہا تھا کہ ہم روزانہ آدھا گھنٹہ موسیقی کے ریاض میں صرف کرتے ہیں۔ دوسرے سوال کا جواب ہم نے صحیح دیا تھا کیوں کہ ہم روزآنہ آدھا گھنٹے تک غسل کرنے کے عادی ہیں۔

اس واقعہ کے بعد ہر رات ہمارا یہ معمول سا بن گیا کہ جاپانی ریستورانوں میں کھانا کھانے کے بہانے جاتے اور جاپانیوں کو اپنا گانا سنا کر واپس آتے۔ آخر میں تو ہمارا تعارف ہی ہندوستانی گلوکار کی حیثیت سے کرایا جانے لگا۔ ایک ریستوران کی مالکن تو ہمارے گانے سے کچھ ایسی مسحور ہوئیں کہ ہم سے کھانے کا بل نہیں لیا بلکہ ہمارے آٹو گراف لے کر نمایاں جگہ پر لگادیئے اور اس کے نیچے جاپانی میں لکھ دیا کہ ہندوستان کا ایک مشہور گلوکار اس ریستوران میں آیا تھا۔ یہ ریستوران ٹوکیو کے علاقہ ہراجوکو میں واقع ہے اگر خدا نخواستہ کوئی ہندوستانی اس ریستوران میں کھانا کھانے جائے اور اسے اس مشہور ہندوستانی گلوکار کا اندازہ لگانے میں دشواری ہو تو اس کی سہولت کے لئے عرض ہے یہ مشہور گلوکار ہم ہی ہیں اگر چہ وطن مالوف میں ہم مشہور نہیں ہیں۔ مگر جاپان میں تو ہم مشہور ہوگئے تھے۔ وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے۔

یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا جو خاصہ طویل ہوگیا ورنہ ہم تو مسٹر ریوجی ایتو کی طرف سے دی گئی گیشا پارٹی کا ذکر کر رہے تھے۔ اس رات بھی ہم نے گیشاوں کے سامنے ہندوستانی موسیقی کے فن میں اپنے بیش بہا کمالات کا مظاہرہ کیا۔ وہ ان کمالات سے اس درجہ متاثر ہوئیں کہ ہمارے ساتھ رقص کرنے پر اصرار کرنے لگیں۔ پانی اب ہمارے سر سے اونچا ہو رہا تھا ہم نے بہت منع کیا معذرت بھی کی کہ ہم نے صرف موسیقی کے فن میں ریاض کیا ہے رقص سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ مگر گیشاوں کا استدلال تھا کہ موسیقی اور رقص لازم و ملزوم ہیں۔ جب گانا گایا ہے تو رقص بھی کیجئیے ہماری حالت دگرگوں ہونے لگی تو ہماری پریشانی کو بھانپ کر مسٹر ریوجی ایتو خود میدان میں آگئے۔ اور ہمارا ہاتھ پکڑ کر رقص کرنے لگے۔ ہمیں زندگی میں پہلی بار رقص کرنے کی سعادت ٹوکیو میں ہی حاصل ہوئی۔ جس گیشا گرل کے ساتھ ہم نے رقص کیا تھا ہم اس سے آج معافی کے طلبگار ہیں کیوں کہ رقص کے دوران کئی مرتبہ ہمارا بھاری پاوں ان کے نازک پاوں پر پڑگیا تھا۔ مگر اللہ رے اس گیشا گرل کی فراخدلی اور دلداری کہ اس نے زبان سے اف تک نہ کی۔ وضعداری کوئی جاپانیوں سے سیکھے۔ گیشاوں اور ریوجی ایتو کے ساتھ رقص و موسیقی کی وہ شام ہمیں کبھی نہیں بھولے گی۔ جب رات خوب بھیگ چکی تو دم رخصت مسٹر ریوجی ایتو نے ہم سے کہا" مسٹر حسین! آپ کل جاپان سے چلے جائیں گے۔

ہماری محبت کو یاد رکھیئے ۔ ایشیائی قوموں میں جب تک محبت نہیں بڑھے گی تب تک ایشیا ترقی نہیں کر سکتا" ۔

ہمیں یاد ہے کہ دوسرے دن یونیسکو کے دفتر پر وداعی تقریب منعقد ہوئی تھی ۔ سارے مندوبین نے مل کر ہمیں یہ ذمہ داری سونپی تھی کہ ہم وداعی تقریر کریں (انہیں نہ جانے کس نے بتادیا تھا کہ ہم وداعی تقریر بہت اچھی کرتے ہیں) جیسا کہ ہماری عادت ہے ہم نے نمک مرچ لگا کر ایک زور دار تقریر تیار کرلی تھی ۔ جب ہماری تقریر ختم ہوئی تو ہم نے دیکھا کہ مسٹر ریوجی ایٹو کی آنکھوں میں آنسو تھے ہم نے مزید غور سے دیکھا تو ہمیں اپنی آنکھوں میں بھی آنسو دکھائی دیئے اور ہمیں یقین آگیا کہ ریوجی ایٹو نے کل رات جس محبت کا ذکر کیا تھا وہ سچ مچ پروان چڑھنے لگی ہے ۔

ایک اور شخصیت کا ذکر بھی ہم اپنے سفر نامہ میں نہ کرسکے ۔ ہماری مراد جاپان کے مشہور گلوکار سگاہارا سے ہے ۔ ان سے موسیقی سے متعلق یونیسکو کی ایک تقریب میں ملاقات ہوئی تھی ۔ پیشہ کے اعتبار سے انجنیئر ہیں لیکن موسیقی ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے ۔ انہوں نے موسیقی کے ذریعہ ساری انسانیت کو متحد کرنے کا ایک باضابطہ منصوبہ بنایا ہے ۔ امریکہ میں ان کے کئی کنسرٹ ہو چکے ہیں ان دنوں وہ کمبوڈیا کے یتیم بچوں کی امداد کے لئے ایک پروگرام پیش کرکے آئے تھے ۔ ان سے ہماری ملاقات ہمارے دوست

شنجی تاکماتے نے کرائی تھی۔ پہلی ملاقات میں وہ ہمارے اور ہم ان کے گرویدہ ہو گئے۔ آخر کو دو بچے اور بڑے موسیقاروں کا ملاپ جو تھا۔ مذاق تھوڑا ہی تھا۔ بڑے ملنسار، خلیق، مہذب اور شائستہ آدمی ہیں۔ ان کے ساتھ بڑی خوش گوار شامیں گزریں۔ جاپان کے بہت مشہور آدمی ہیں۔ جاپان ٹیلی ویژن پر بھی اکثر ان کے پروگرام ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی ہم ان کے ساتھ کسی ریستوراں میں جاتے تو لوگ انہیں پہچان کر فرمائش کرنے لگ جاتے کہ وہ اپنا گانا سنائیں مگر وہ ازراہ ہمت افزائی و مہمان نوازی وذرہ نوازی پہلے ہم سے فرمائش کرتے کہ ہم ہی کوئی ہندوستانی گانا سنائیں اور ہم اس کے جواب میں ان کے سامنے تقدیم و تاخیر کا مسئلہ لے بیٹھتے تھے اور انہیں اس نزاکت سے واقف کراتے تھے کہ ہمارے ہاں مشاعروں اور موسیقی کی محفلوں میں بزرگوں اور استادوں کو بعد میں دعوت سخن دی جاتی ہے۔ سگاہارا کا گانا ہم نے کئی بار سنا۔ جاپانی گانے کا مطلب تو خیر ہماری سمجھ میں کیا آتا مگر سگاہارا کی آواز کا جادو ہمارے سارے وجود میں سرایت کر جاتا تھا۔ شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو، والا معاملہ تھا۔

سگاہارا نے ایک شام ہم سے کہا روزانہ جاپانی ریستورانوں میں جاتے جاتے آپ تھک گئے ہوں گے۔ آج آپ کو ایک مغربی ریستوران میں لے چلتے ہیں۔ ہم شاید پہلے بتا چکے ہیں کہ جاپانی ریستورانوں میں روشنی بہت زیادہ ہوتی

ہے اور اس وافر روشنی کا شخصی فائدہ ہمیں یہ پہنچتا تھا کہ ہم کھانے کی ہر شئے کو دیکھ بھجھ کر اور ٹھونک بجا کر کھایا کرتے تھے (جاپانی کھانے کے نام پر ہر چیز کھالیتے ہیں) مغربی ریستوران میں پہنچے تو ماحول خاصا نیم تاریک تھا۔ سگاہارا نے تجویز رکھی کہ کھانے سے پہلے کچھ چرندم خورندم یعنی snacks بھی منگوالیتے ہیں۔ ہم نے کہا آپ کے مہمان ہیں آپ جو چاہیں سو منگائیں۔ بس اتنا کرم کریں کہ سور کے گوشت سے ہمیں محفوظ رکھیں۔ سگاہارا نے بیرے کو بلا کر بڑی دیر تک آرڈر دیا اور تھوڑی دیر بعد ایک پلیٹ میں بادام کی شکل کی کچھ چیزیں لاکر ہمارے سامنے رکھ دی گئیں۔ ہم نے بسم اللہ کی اور اس شئے کو منہ میں ڈالا تو اس شئے کا ذائقہ بھی بادام کا سا لگا بلکہ بادام سے کچھ زیادہ ہی اچھا لگا ہم نے بیک وقت چار پانچ بادام منہ میں ڈالے اور ازراہ تحسین سگاہارا سے کہا "برادر عزیز! جاپان کے بادام تو ذائقہ میں بے حد لذیذ اور خستہ ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں کے بادام اتنے لذیذ نہیں ہوتے" ہماری بات کو سن کر شنجی تاجیما نے کہا "مسٹر حسین! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے یہ بادام نہیں ہیں"۔

ہم نے کچھ دیر سوچ کر کہا "تو پھر چلغوزے ہوں گے" (ہمیں سوچنے میں دیر اس لئے ہوئی کہ ہمیں چلغوزے کی انگریزی ہاتھ نہیں آرہی تھی)

تاجیما نے کہا "یہ چلغوزے بھی نہیں ہیں"

ہمارا خیال پستہ کی طرف گیا۔ مگر ہمارے ذہن میں پستے کی انگریزی

ہنیں آئی ۔یوں بھی ہم شیکسپیر، ٹی ایس ایلیٹ یا سامرسٹ مام تھوڑے ہی ہیں
کہ پستے کی انگریزی تک یاد رکھیں ۔ لہٰذا اپنی انگریزی دانی سے مجبور ہو کر تاجیما
سے پوچھ بیٹھے کہ جان من آخر یہ کیا چیز ہے ؟ تاجیما نے کہا " مسٹر حسین ! یہ
GRASS HOPPERS ہیں"

یہ سن کر ہمارے منہ سے اردو میں بے ساختہ نہ صرف "ٹڈے" کا لفظ
نکلا بلکہ دو عدد سالم ٹڈے بھی نکل آئے ۔ جاپانی ہونے کے ناطے تاجیما نے
ٹڈے کو بھی انگریزی لفظ جانا اور تردید کے طور پر اپنے ہاتھ کی دو انگلیوں کو ملا
کر گھاس میں ٹڈے کے اچھلنے کی نقل اتارتے ہوئے کہا

NO MR. HUSSAIN. THIS IS NOT TIDDA. THIS IS ::
GRASS HOPPER

ٹڈے کی اصلیت جانتے ہی ہماری زبان پر اب تک بادام کا جو ذائقہ تھا وہ کافور
ہو گیا ۔ ہم نے اچھا اچھا کہہ کر ٹائلیٹ کا رخ کیا ۔ بڑی دیر تک ٹڈوں کو اپنے پیٹ
میں سے باہر نکالنے کی کوشش کی مگر اس دن نہ جانے ٹڈوں کو کیا ہو گیا تھا کہ
اچھل کر پیٹ سے باہر ہی نہ آتے تھے ۔ جب ہم کلیوں سے فارغ ہو کر دوبارہ
کھانے کی میز پر آئے تو ٹڈوں کے ذائقہ کے سلسلے میں ہماری تعریف سے متاثر
ہو کر سگاہارا نے ٹڈوں کی ایک اور پلیٹ منگوالی تھی وہ تو اچھا ہوا کہ مغربی
ریستوارن میں نیم تاریکی تھی ۔ ہم ٹڈوں کو جھوٹ موٹ ہی منہ تک لے جاتے

تھے ۔ اور پھر مناسب موقع پا کر انہیں جیب میں اتار لیتے تھے ۔ تاجیما نے بتایا کہ جاپان میں ٹڈے بہت قیمتی ہوتے ہیں ۔ ایک سو ین میں ایک ٹڈا ملتا ہے یوں بھی جاپان میں کاشت کے ترقی یافتہ طریقوں کے باعث ٹڈے ہنیں پائے جاتے ۔ انہیں کوریا سے درآمد کیا جاتا ہے ۔ انہیں بہت سلیقہ سے بھونا جاتا ہے ۔ تبھی تو یہ اتنے ذائقہ دار اور خستہ ہوتے ہیں" ۔

وہ ٹڈوں کی افادیت کی اور ہم ان کے ذائقہ کی تعریف کرتے رہے ۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس رات ہمارے حصہ میں پندرہ سو ین کے ٹڈے آئے تھے ۔ پانچ سو ین کے ٹڈے تو ہم کھا چکے تھے بقیہ ایک ہزار ین کے دس عدد ٹڈے ہم نے اپنے ہوٹل پر واپس آکر جیب میں سے برآمد کئے تھے ۔ کمبختوں کو اس خوبی سے بھونا گیا تھا کہ ان کی مونچھیں تک صاف دکھائی دیتی تھیں ۔ اگر کبھی آپ جاپان جائیں اور آپ کو بادام کھانے کا موقع ملے تو دیکھ لیجئیے کہ کہیں اس بادام کے مونچھیں تو ہنیں ہیں ۔ سگاہارا اس رات دو باتوں کی وجہ سے بہت خوش تھے ۔ پہلی وجہ تو یہ کہ ہمیں ٹڈوں کا ذائقہ پسند آیا تھا ۔ دوسری وجہ یہ کہ اس دن ان کے گانے کا نیا ریکارڈ بازار میں آیا تھا ۔ پہلا ریکارڈ وہ ہمارے لئے لے آئے تھے بڑی محبت سے ہمیں یہ ریکارڈ پیش کیا اور کہا " ہندوستان میں یہ ریکارڈ بجایا کیجئیے تاکہ میں آپ کو یاد آسکوں " سگاہارا ہمیں سچ مچ یاد آتے ہیں ۔ ہم ان کا ریکارڈ بجا کر ہی انہیں یاد ہنیں کرتے بلکہ جہاں کہیں بھی ٹڈا نظر آتا ہے تو

سگاہارا کی یاد ہمارے ذہن میں اچھلنے لگتی ہے۔

ایسی ہی کتنی لطیف اور مزے دار باتیں تھیں جن کے ذکر سے یہ سفر نامہ خالی ہے۔ ہم یوکوہاما، کیوٹو اور نارا بھی گئے۔ ان شہروں کا حال احوال بھی اس سفرنامہ میں بیان نہ ہو سکا۔ نارا جاپان کا قدیم دارالحکومت رہا ہے بعد میں کیوٹو دارالحکومت بنا۔ پچھلی صدی کے آخری ربع تک جاپان کے شہنشاہ یہیں رہا کرتے تھے۔ نارا اور کیوٹو کے پگوڈوں کو دیکھ کر ہم دم بخود رہ گئے۔ لکڑی کی ایسی عظیم الشان عمارتیں بنانا جاپانیوں کا ہی حصہ ہے۔ جاپان کے ان دو قدیم شہروں میں جاپان کی تاریخ خوابیدہ ہے۔ جاپانیوں کی قسمت کے فیصلے یہیں ہوتے تھے۔ کیوٹو کے ہالی ڈے ان ہوٹل کی کھڑکی سے آدھی رات کے وقت چاندنی میں سوئے ہوئے اس شہر کو دیکھتے تھے تو جاپان کی تاریخ کے کئی کردار ہمارے تصور میں زندہ ہو جاتے تھے۔ ان شہروں کی اسی تاریخی و تہذیبی اہمیت کے پیش نظر دوسری جنگ عظیم میں ان شہروں پر بمباری نہیں کی گئی۔ کیوٹو ہی وہ شہر ہے جہاں ۱۸۶۸ میں توکوگاوا فوجی حکمران خاندان کے آخری سربراہ نے شہنشاہ جاپان میجی کو اقتدار سونپا تھا کہ حضرت آپ ہی اس ملک کو سنبھالئے۔ ہم سے یہ نہیں سنبھلتا۔ ۱۸۶۸ سے پہلے دنیا میں جاپان کی کوئی حیثیت تھی نہ اہمیت۔ میجی حکومت نے ہی وہ انقلابی فیصلے کئے جن کی بنا پر جاپان آج اتنی ترقی کر چکا ہے۔ شہنشاہ میجی کی حکومت نے ہی جاپان کے

تعلقات امریکہ اور یوروپی ممالک سے پیدا کیئے ورنہ اس سے پہلے جاپان گوشہ نشین سا ملک تھا۔ جاپانیوں نے صرف ایک صدی کے اندر مغربی ممالک کی سائنس اور ٹکنالوجی سے کچھ اس طرح استفادہ کیا کہ آج ترقی کے میدان میں مغربی ممالک سے آگے نکل گئے ہیں۔ ہم جاپان کی حیرت انگیز ترقی کا حال بھی لکھنا چاہتے تھے۔ لیکن یہ سوچ کر ٹال گئے کہ ممکن ہے آپ جس گھڑی کو دیکھ دیکھ کر اپنی عمر عزیز کا قیمتی وقت ضائع کر رہے ہیں وہ جاپانی ہو، آپ جس کیمرے کی مدد سے اپنی زندگی کے خوشگوار واقعات کو محفوظ کر رہے ہیں وہ جاپانی ہو، آپ کے کان جس مدھر آواز کو سن رہے ہیں وہ شاید کسی جاپانی ٹرانسسٹر یا ٹیپ ریکارڈر سے آرہی ہو۔ آپ جس ٹیلی ویژن پر کوئی خوبصورت فلم دیکھ رہے ہوں وہ شاید جاپانی ہو۔ اگر آپ موٹر نشین ہیں تو آپ کے دل میں شاید یہ تمنا بھی ہوگی کہ ایک دن کوئی جاپانی موٹر آپ کے در پر کھڑی ہو۔ جاپانیوں نے اپنی اشیاء کے ذریعہ ساری دنیا میں ہتلکہ مچادیا ہے ہم کچھ لکھ کر اس ہتلکہ میں مزید کیا اضافہ کر سکتے تھے۔

صاحبو! ٹوکیو میں ہم نے بہت آوارہ گردی کی۔ بلکہ آوارہ گردی کے سوائے کچھ بھی نہیں کیا۔ ہر رات ایک دو بجے سے پہلے اپنے ٹھکانے پر واپس نہیں آتے تھے۔ ابتداء میں ڈر ہوتا تھا کہ کسی دن کوئی چور اچکا ہماری مزاج پرسی نہ کرلے۔ مگر ہمیں کوئی چور اچکا نہ ملا۔

جاپان وہ واحد ملک ہے جہاں جرائم کی تعداد سب سے کم ہے۔ اگرچہ ہمیں پولیس نظر نہیں آتی تھی مگر پھر بھی ہر طرف امن ہی امن نظر آتا تھا۔ ہماری طرح نہیں کہ پولیس تو جگہ جگہ نظر آتی ہے مگر امن و امان کہیں نظر نہیں آتا۔ سارے جاپان میں مصیبت کے وقت پولیس کو طلب کرنے کا ایک ہی فون نمبر ہے۔ اگر آپ ایک فون کر دیں تو پولیس زیادہ سے زیادہ تین منٹ ۲۳ سکنڈ کے اندر اندر مقام واردات پر پہونچ جاتی ہے۔ ہماری پولیس کی طرح نہیں کہ فون کرنے کے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد بڑے اطمینان کے ساتھ سیٹیاں بجاتی ہوئی چلی آتی ہے۔ ہماری پولیس امن کم قائم کرتی ہے اور سیٹیاں زیادہ بجاتی ہے۔

سچ بات تو یہ ہے کہ جاپان میں ۳۵ دن گزارنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچے کہ جاپان بڑا غریب اور مفلوک الحال ملک ہے۔ جاپانیوں کے پاس نہ وسائل ہیں نہ معدنیات کے ذخائر۔ کوئی خام مال ان کے پاس نہیں ہے۔ زراعت بھی بس ایسی ہے کہ اپنا پیٹ بھر سکیں۔ جاپان کے غریب باشندے سارا خام مال دوسرے ملکوں سے درآمد کرتے ہیں۔ ان کا کمال صرف اتنا ہی ہے کہ اس خام مال سے دنیا جہاں کی چیزیں بناتے ہیں اور دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں کو پریشان کرتے ہیں۔ جاپانیوں کے پاس ایک ہی قابل قدر شئے ہے اور وہ ہے ان کا کردار۔ ہم اکثر سوچتے ہیں کہ یہ جو ہم جاپانی گھڑیوں ٹرانزسسٹروں

موٹروں، کیمروں اور ٹیلی ویژن سیٹوں کو اپنے ملک میں قانونی اور غیر قانونی طور پر درآمد کرنے میں لگے ہوئے ہیں تو یہ غلط بات ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم کسی طرح جاپانیوں کے کردار کو درآمد کر لیں۔ اس میں اکسائز ڈیوٹی بھی نہیں لگے گی اور کسٹم والوں کے ہاتھوں آپ کو پریشان بھی نہیں ہونا پڑے گا اس مسئلہ پر ذرا سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ چونکہ ہم سنجیدگی سے غور کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ اس لئے اس مسئلہ کو آپ سے رجوع کر رہے ہیں۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ آپ بھی اس مسئلہ کو کسی اور سے رجوع کریں گے۔ یہی تو ہمارے کردار کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

اس سفر نامہ میں ہم ان ساتھی مندوبین کا بھی ذکر نہ کر سکے جن کی مستقل رفاقت میں ہم نے جاپان کے شب و روز گزارے۔ اگرچہ بارہ ممالک کے مندوبین یونیسکو کے اس سمینار میں شریک تھے مگر ان میں سے سری لنکا کے مندوب جیا کوڈی، تھائی لینڈ کی مندوب (بلکہ مندوبہ) مس پرینیا اور کوریا کے مندوب مسٹر کم kim کی یاد ہمیں اب بھی اکثر آتی ہے۔ ہم نے جان بوجھ کر ان کا قصہ نہیں چھیڑا۔ کیونکہ ذکر ان "پری وشوں" کا ہو اور "بیان" ہمارا ہو تو اس قصہ کو ختم کرنا مشکل ہو جاتا۔ سری لنکا کے مندوب جیا کوڈی ہمیں انگریزی میں BIG BROTHER یعنے بڑا بھائی کہتے تھے۔ دنیا کے نقشہ میں سری لنکا اور ہندوستان کے محل وقوع اور رقبہ کے پس منظر میں اگر وہ ہمیں

بڑا بھائی کہتے تھے تو ٹھیک ہی کہتے تھے مگر کئی معاملوں میں وہ اپنے بڑے بھائی سے بھی آگے نکل جاتے تھے ۔ مسخرگی ان کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ۔ بھلا ہمیں کیونکر نہ بھاتے ۔ سری لنکا کے بہت بڑے پبلشر ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سری لنکا کے اس وقت کے وزیر اعظم مسٹر پریم داس کی تصنیف کردہ کتابوں کے پبلشر بھی یہی ہیں ۔ (مسٹر پریم داس سری لنکا کے مشہور ادیب ہیں) اپنے وزیر اعظم کی کئی کتابوں کا بوجھ بھی اپنے ساتھ لاد کر جاپان لے آئے تھے ۔ جس کسی سے ملاقات ہوتی فوراً اس کی خدمت میں اپنے وزیر اعظم کی کتابوں کا تحفہ پیش کر دیتے تھے اور بہت خوش ہوتے تھے کہ چلو سامان کا کچھ بوجھ تو کم ہوا ۔ اکثر کہتے تھے کہ سری لنکا کے وزیر اعظم نے انہیں بطور خاص اس سمینار میں شرکت کیلئے نامزد کیا ہے ۔ ہر دم وزیر اعظم سری لنکا سے گہرے روابط و مراسم کا ذکر کرتے اور ہم سے پوچھتے رہتے کہ ہندوستان کی وزیر اعظم سے ہمارے مراسم کیسے ہیں ۔ ہمیں بھی جواباً کہنا پڑتا تھا کہ ہمیں بھی ہندوستان کی وزیر اعظم نے بطور خاص اس سمینار میں شرکت کے لئے بھیجا ہے اور یہ کہ ہم بھی وزیر اعظم ہندوستان کے خاص آدمی ہیں اور ہمارے مشورے کے بغیر حکومت ہند کوئی فیصلہ نہیں کرتی ۔ ہم اپنی دانست میں یہ سمجھتے تھے کہ جیا کوڈی چونکہ صرف ڈینگ ہانکتے ہیں اس لئے ہمیں بھی ڈینگ ہانکنے کا حق حاصل ہے ۔ مگر انہی دنوں جب وزیر اعظم سری لنکا جاپان کے سرکاری

دورے پر آئے تو یہ ہمیں اپنے وزیر اعظم سے ملانے کے لئے لے گئے۔ ملاقات سے پہلے ہمیں پابند بھی کیا کہ ہم ان کے وزیر اعظم کی دو چار کتابیں پڑھ کر چلیں ان کے بارے میں رائے بھی دیں۔ ہمیں یہ دیکھکر تعجب ہوا کہ وزیر اعظم سری لنکا سے جیا کوڈی کے سچ مچ بہت گہرے اور بے تکلفانہ مراسم ہیں۔ جیا کوڈی یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان اور سری لنکا کے بیچ یہ جو چند نزاعی امور ہیں تو ان کو سلجھانے کے لئے ہم اپنے اثرات اور رسوخ کو کام میں لے آئیں۔ کہتے تھے میں اپنے وزیر اعظم کو سمجھاتا ہوں تم اپنی وزیر اعظم کو سمجھاو۔ جیا کوڈی نے ہمیں سری لنکا آنے کی دعوت بھی دی تھی۔ کہتے تھے کہ تمہارا سرخ قالین والا خیر مقدم کرواونگا۔ مگر وہ تو خدا کا شکر ہوا کہ ان کے سری لنکا اور ہمارے ہندوستان واپس آنے کے چند ہی دنوں بعد مسٹر پریم داس کی حکومت ٹوٹ گئی جس حکومت کے مشیر جیا کوڈی ہوں اس کا یہ حشر تو ہونا ہی تھا۔

ایک دن ہم نے جیا کوڈی سے شکایت کی کہ آپ اپنے وزیر اعظم کی کتابیں ہر کس و ناکس کو کیوں پیش کرتے رہتے ہیں۔ بڑی سنجیدگی سے بولے "سری لنکا میں تو ان کتابوں کو کوئی نہیں پڑھتا" پھر اپنے وزیر اعظم کی کتابوں کے انبار کی طرف اشارہ کرکے بولے "جب تک میں اپنے سامان میں سے ان کتابوں کے بوجھ کو کم نہیں کر دیتا تب تک جاپان سے اپنا پسندیدہ سامان نہیں لے جاسکتا" ہوٹل کے عملہ میں بھی وزیر اعظم سری لنکا کی کتابیں خاص مقبول

ہوگئی تھیں۔

جیاکوڈی بہت دلچسپ آدمی ہیں۔ کبھی ہم لوگ کسی مقام سے دو ٹیکسیاں لے کر اپنے ہوٹل پہنچتے تھے تو وہ بڑے غور سے دونوں ٹیکسیوں کے میٹر کا مطالعہ ضرور کرتے تھے اور اس بات پر گھنٹوں اظہار حیرت کرتے رہتے تھے کہ دونوں ٹیکسیوں کے کرایہ کی رقم یکساں کیوں ہوتی ہے۔ ان کا کہنا تھا سری لنکا کی ٹیکسیاں کرایہ کے معاملہ میں کبھی "ہم خیال" اور "متفق" نہیں ہوتیں ایک ٹیکسی کا کرایہ دوسری ٹیکسی سے نہیں ملتا۔ انہیں اس بات پر دکھ ہوتا تھا کہ بھلے ہی جاپانی بے ایمانی نہ کریں مگر ان کی مشینوں کو تو تھوڑی بہت بے ایمانی کرنی چاہئیے۔ ہماری مشینوں کو دیکھو کہ ہماری ہی طرح دھوکہ باز ہوتی ہیں۔

اس سال کے اوائل میں جیاکوڈی ہندوستان آئے تھے۔ دہلی پہنچتے ہی ہمیں فون کیا۔ ہم ملنے گئے تو بڑی دیر تک جاپانیوں کی طرح جھک جھک کر ہمارا استقبال کرتے رہے۔ ہم نے بھی جواباً جھکنا شروع کیا تو جاپان میں قیام کے دنوں کو یاد کر کے زوردار قہقہ لگایا اور بولے "مسٹر حسین! یاد کرو، ہم بھی کن ایماندار مہذب اور با اخلاق لوگوں کے بیچ پھنس گئے تھے۔ میرا تو دم گھٹتا تھا میرا بس چلے تو جاپان کو ایشیا سے نکال دوں" جیاکوڈی نے ہمیں بتایا کہ وہ سیر و سیاحت کی غرض سے ہندوستان نہیں آئے ہیں بلکہ صرف ہم سے ملنے آئے

ہیں ۔ مگر ٹیکسیوں میں گھوم کر انہوں نے جس طرح دہلی کے تاریخی مقامات دیکھے اس سے ہمیں شبہ ہوا کہ ان کے سفر کی اصل غرض وغایت تو سیر وسیاحت ہی تھی ۔ ہم سے ملنے کا تو صرف ایک بہانہ تھا ۔ جب ہم دہلی کے ٹیکسی ڈرائیوروں سے کرایہ کے مسئلہ پر لڑتے تھے تو بہت خوش ہوتے تھے ۔ کہتے تھے ہندوستان اور سری لنکا کی تہذیب کے کئی عناصر مشترک ہیں ۔ جب تک ٹیکسی ڈرائیور سے جھگڑا نہ کرو ٹیکسی میں بیٹھنے کا لطف ہی نہیں آتا ۔ ایک دن ہم نے ان کے سابق وزیر اعظم کا حال پوچھا تو بولے "میرے وزیر اعظم کو مارو گولی ۔ ذرا اپنا حال سناؤ تم تو کہتے تھے کہ تم ہندوستان کی وزیر اعظم کے خاص آدمی ہو ۔ ہم نے تمہیں اپنے وزیر اعظم سے ملایا تھا ۔ اب ہم ہندوستان آئے ہیں تو اپنی وزیر اعظم سے بھی ملاؤ" ۔

ہم نے کہا "جیا کوڈی! وہ سب جاپان کی باتیں تھیں ہندوستان کی وزیر اعظم سے ملنا کوئی آسان کام نہیں"

بولے "بھئی تم تو کہتے تھے کہ تم وزیر اعظم کے خاص آدمی ہو ۔ کیا یہ بات غلط تھی"

ہم نے کہا "جیا کوڈی! یہ بات غلط نہیں تھی ۔ بلاشبہ ہم اپنی وزیر اعظم کے خاص آدمی ہیں کیونکہ پچھلے انتخابات میں ہم نے انہیں ووٹ دیا تھا ۔ اس اعتبار سے خاص آدمی ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ ہم ان سے

تمہاری ملاقات نہیں کرا سکتے"

ہماری بات کو سنکر انہوں نے ہمیں خالص ہندوستانی میں وہ گالی دی جسے انہوں نے ہم سے ہی جاپان میں سیکھا تھا۔ اس گالی کا قصہ کچھ یوں ہے کہ جیاکوڈی نے ایک دن ہم سے پوچھا کہ ہندوستانی میں مہذب اور شایستہ سلام کے لئے کن الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ہم نے ان سے " نمستے " کہنے کے لئے کہا۔

بولے " نمستے "تو میں جانتا ہوں۔کوئی اور مہذب سلام سکھاو"

ہم نے "آداب عرض " کا نسخہ تجویز کیا۔

بولے " یہ بھی نہیں چلے گا کوئی ایسا سلام سکھاو جو بہت ہی مہذب ہو"

ہمیں مذاق سوجھا اور ہم نے انہیں ایک ناقابل اشاعت گالی سکھادی ۔ بہت خوش ہوئے اور ہر صبح کو اسی گالی سے ہمارا استقبال کرنے لگے ۔ہم بھی جی ہی جی میں خوش ہوتے رہے کہ چلو دیار غیر میں کوئی ہمیں گالی دینے والا بھی ہے۔ ایک دن ہم لوگ گنزہ کی ایک ہندوستانی ریستوران میں کھانا کھانے گئے ۔ جیاکوڈی نے اتنی محنت سے ہم سے یہ سلام سیکھا تھا۔ اس نادر موقع کو بھلا کس طرح ہاتھ سے جانے دیتے ۔ انہوں نے ہندوستانی بیرے کو بلا کر نہایت ادب کے ساتھ اپنی دانست میں ہمارا سکھایا ہوا سلام عرض کردیا ۔ ہم چپ چاپ بیٹھے تماشہ دیکھتے رہے ۔ بیرے نے منیجر سے شکایت کی اور جب منیجر ان سے

باز پرس کرنے کیلئے آیا تو جیا کوڈی نے جھک کر پھر یہی سلام ان کی خدمت میں پیش کر دیا ۔ منیجر سمجھدار آدمی تھا اس نے جان لیا کہ دال میں کچھ کالا ہے ۔ اس نے الگ لیجا کر جیا کوڈی کو سلام کے معنی و مفہوم سے آگاہ کیا ۔ جیا کوڈی ٹیبل پر واپس آئے تو نہایت غیر مہذب لہجہ میں یہی سلام ہماری خدمت میں پیش کرتے ہوئے بولے " تم بہت سنگین مذاق کرتے ہو، وہ تو اچھا ہوا کہ منیجر شریف آدمی تھا اگر کوئی دوسرا ہندوستانی ہوتا تو نہ جانے اس سلام کا جواب مجھے کس طرح ملتا " بعد میں جیا کوڈی نے بہت چاہا کہ ہم بھی سہنالی زبان میں ان سے سلام کرنے کے مہذب اور شائستہ کلمات سیکھ لیں ۔ مگر ہم نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا ۔ غرض جیا کوڈی بہت دلچسپ آدمی ہیں ۔ ان کی ذات بے برکات کے باعث جاپان میں جی کھول کر ہنسنے کے بے شمار مواقع ملے وہ جہاں بھی رہیں خوش رہیں اور اپنے وزیر اعظم کی کتابیں چھاپتے رہیں ۔

جنوبی کوریا کے مندوب مسٹر کم نہایت سنجیدہ، متین اور خاموش طبع آدمی تھے ۔ کوریا کے مشہور افسانہ نگار ہیں ۔ ہر اعتبار سے جیا کوڈی کی ضد تھے ۔ ہمارے سوائے کسی سے بات نہیں کرتے تھے ۔ ہمیشہ خاموش اور گمبھیر رہنا ان کی عادت تھی ۔ روزانہ اپنی بیوی کے خط کا بے چینی سے انتظار کرتے تھے ۔ جس دن خط نہیں آتا تھا اپنا غم غلط کرنے کیلئے ہمارے پاس آجاتے تھے ۔ اور کوریائی ادب کی نزاکتوں، لطافتوں، تہہ داریوں اور باریکیوں سے ہمیں واقف

کراتے تھے ۔ جیاکوڈی سے ان کی بالکل نہیں بنتی تھی ۔ اور وہ بھی جیاکوڈی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے ۔ کہتے تھے صرف تمہاری وجہ سے جیاکوڈی کو برداشت کرتا ہوں ۔ دوسری طرف جیاکوڈی بھی کم کے تعلق سے بھی جملہ ہم سے بولتے تھے ۔ جیاکوڈی کا خیال تھا کہ جو آدمی اپنی بیوی کے خط کے لئے اتنا بے چین رہتا ہو وہ اور تو سب کچھ کر سکتا ہے افسانہ نگار ہرگز نہیں ہو سکتا ۔ مگر کم کی یہی ادا ہمیں بہت بھاتی تھی ۔

دوپہر کے کھانے میں یہ دونوں حضرات ہمارے ساتھ ہوتے تھے ۔ مینو کے مسئلہ پر ان دونوں میں کبھی اتفاق رائے نہیں ہوتا تھا ۔ لہذا ثالث کی حیثیت سے یہ مسئلہ ہم ہی حل کرتے تھے ۔

ایک دن کم نے کہا "آج دوپہر کا کھانا آپ کے ساتھ نہیں کھاوں گا"

ہم نے پوچھا "بھوک نہیں لگی ہے کیا ؟"

بولے " نہیں ! آج بہت بھوک لگی ہے یہیں قریب میں ایک کوریائی ریستوران ہے ۔ آج میں کوریائی کھانا کھاوں گا" ۔

ہم نے کہا "ایسی بات ہے تو چلو آج ہم بھی کوریائی کھانا کھالیتے ہیں ۔ دیکھیں کیسا ہوتا ہے ؟"

مگر جیاکوڈی نے ہمیں کہنی مار کر کہا "ان سے پوچھو یہ ہمیں کوریائی ریستوراں میں کیا کھلائیں گے ؟"

کم نے کہا" میں تو کتا کھاؤں گا"

ہمیں اپنی سماعت پر اعتبار نہ آیا۔ پوچھا" پھر سے بتاؤ کیا کھاؤ گے؟"

کم نے باآواز بلند کہا" میں تو کتے کا گوشت کھاؤں گا۔ آپ جو پسند کریں کھائیں"۔

جیاکوڈی نے ابکائی لیتے ہوئے اور کتے کے بھونکنے کی آواز نکالتے ہوئے کہا" ہف ہف! کتا؟ کیا تم کتا کھاؤ گے؟"

کم نے کہا" تم سری لنکا کے باشندے ہو تمھیں کیا معلوم کہ کوریائی کتا کتنا لذیذ ہوتا ہے۔ کوریا کا پیلے رنگ کا کتا عام کتوں سے مختلف ہوتا ہے۔ اس کے گوشت کی لذت دنیا کے کسی جانور کے گوشت میں نہیں ہوتی"

اب کی بار ہم نے اپنی ابکائی کو روکتے ہوئے کم سے کہا" بھائی! تم جیاکوڈی سے بحث میں نہ پڑو۔ جاؤ اور اطمینان سے کتا کھاآو"۔

کم چلے گئے تو جیاکوڈی نے اس دن دوپہر کا کھانا بالکل نہیں کھایا۔ ہمارے سامنے بیٹھے" ہف ہف ہف" کرتے رہے ہم نے کھانے کے لئے اصرار کیا تو بولے" میں بلی کھانا چاہتا ہوں۔ کھلاؤ گے؟ میں چوہا کھانا چاہتا ہوں۔ کھلاؤ گے؟ میں گدھ کھانا چاہتا ہوں۔ کھلاؤ گے؟ میں بچھو کھانا چاہتا ہوں۔ کھلاؤ گے؟ ہف ہف ہف"

جیاکوڈی کی باتیں سن کر ہم نے بھی کھانے سے ہاتھ روک لیا۔

سمینار کے دوپہر کے اجلاس میں کم کوریائی کتا کھا کر واپس ہوئے تو

بہت خوش تھے۔ جیاکوڈی پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھتے رہے۔ کم کبھی ہنستے نہیں تھے مگر اس دن ہم سے بہت ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے۔ آخر کو اپنا من پسند کتا جو کھا کر آئے تھے۔

جیاکوڈی نے چپکے سے ہمارے کان میں کہا" یہ ضرور کتے کی دم کھا کر آیا ہے۔ تبھی تو تمہاری خوشامد کر رہا ہے اور تمہارے آگے بچھا جا رہا ہے"۔

ہم نے جیاکوڈی کو ٹوکا تو انہوں نے خفیف آواز میں یوں "ہف ہف" کہا جیسے کتے کا پلہ بول رہا ہو۔ اس کے بعد سے کم جہاں بھی نظر آتے جیاکوڈی "ہف ہف" کرنے لگ جاتے۔

کم بہت کم گو تھے۔ دن بھر میں جتنے جملے بولتے تھے اس کا حساب جیاکوڈی رکھتے تھے۔ شام کو یہ حساب ہمارے سامنے پیش ہوتا تھا۔ کبھی ان جملوں کی تعداد پندرہ سے بڑھنے نہیں پائی (جملوں کا ان کا سب سے زیادہ اسکور اس دن تھا جب انہوں نے کتا کھایا تھا) اتنا کم بولنے کے باوجود سمینار کے خاتمہ کے بعد جب وہ جانے لگے تو ہم سے بچھڑتے وقت ان کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ ہمیں یوں لگا جیسے وہ ہم سے بہت کچھ بول گئے ہوں۔

تھائی لینڈ کی مندوب مس پرینیا کی شخصیت کی دلنوازی کا حال ہم کیا بیان کریں۔ بڑی دلاویز اور موہنی سی ہستی ہیں۔ بنکاک میں ایجوکیشن افسر ہیں۔ ہنسنا اور لگاتار ہنسنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ ہماری باتوں پر گھنٹوں ہنسا

کرتی تھیں ۔ ہنسنے سے فرصت ملتی تو پھر انہیں باتوں پر از سر نو بہ انداز دگر ہنسنے لگ جاتی تھیں ۔ ان میں ہنسنے کی یہ انوکھی صلاحیت نہ جانے کہاں سے آئی تھی ۔ ہم اتنا ہنسیں تو خون تھوکنے لگ جائیں ۔ ہماری باتوں پر فریفتہ تھیں اور بہ زبان انگریزی ہم سے کہتی تھیں MR. Hussain you are a real man ہم نے اپنی ناچیز ہستی کے بارے میں ان کی قیمتی رائے کو انگریزی میں جوں کا توں اس لئے پیش کیا ہے کہ اردو میں اس جملہ کے ترجے سے غیر ضروری اور بے بنیاد شکوک وشبہات کے پیدا ہونے کا احتمال ہے انگریزی زبان میں جو تہہ داریاں ہیں وہ اردو میں کہاں ۔ غرض مس پرینیا ہر دم ہنستی رہتی تھیں ۔ ہم نے کسی خاتون کو آج تک اس قدر بے تحاشہ اور والہانہ انداز میں ہنستے ہوئے نہیں دیکھا ۔ سمینار میں سنجیدہ بحث چل رہی ہوتی تو تب بھی ان کی خوش مزاجی کو چین نہیں آتا تھا ۔ کاغذ کے چھوٹے چھوٹے پرزوں پر سمینار کی بحث کے تعلق سے دلچسپ جملے لکھ کر ہماری طرف بڑھا دیتی تھیں ۔ اور جب ہم ان کے جملوں پر دلچسپ تبصرے لکھکر بڑھا دیتے تو ٹیبل کے نیچے اپنا منہ ڈال کر ہنسنے لگ جاتی تھیں ۔ بعض بعض تبصروں پر تو انہیں جی کھول کر ہنسنے کے لئے ٹائلٹ میں جانے کی ضرورت پیش آتی تھی ۔ سمینار کے بعد ہمارے ایسے تبصروں پر اظہار خفگی کرتیں اور فرماتی تھیں ۔

YOU NAUGHTY MAN ! YOU MAKE ME GO TO

TOILET TO LAUGH AT YOUR FUNNY REMARKS

ہماری مزاح نگاری پر اردو میں آج تک کسی ناقد نے ایسا بھرپور تبصرہ نہیں کیا

مس پرینیا کا دوسرا محبوب مشغلہ اپنے منگیتر کو خط لکھنا تھا۔ شام میں

کہیں گھومنے کا پروگرام بنتا اور ہم انہیں بلانے کو پہنچتے تو کہتیں " بس ذرا سا

توقف کریں۔ اپنے منگیتر کے نام خط کو مکمل کر لوں۔ خط لکھتی جاتی تھیں اور

ساتھ ساتھ ہنستی بھی جاتی تھیں۔ پتہ نہیں کیا کیا لکھتی تھیں۔ ادھر ہم منتظر

رہتے کہ ان کا خط ختم ہو تو یہاں سے چلیں "

ہم بے چین ہو کر کہتے " مس پرینیا! دیر ہو رہی ہے "

قلم کو اپنے گال پر رکھ کر فرماتیں " آپ ہی کی وجہ سے دیر ہو رہی ہے۔ اپنے منگیتر

کو آپ کی دلچسپ باتیں لکھ رہی ہوں "۔

فرماتیں " آپ کو پتہ نہیں۔ وہ بہت خوش ہوگا۔ وہ بھی آپ ہی کی طرح

Naughty man ہے " بنکاک سے جب ان کے منگیتر کا خط آتا تو اس کے

" قابل اشاعت حصے " ہمیں ترجمہ کے ساتھ پڑھ کر سناتی تھیں۔

شاپنگ کا انھیں بے پناہ شوق تھا۔ ہمیشہ اپنے منگیتر کے لیئے کچھ نہ کچھ

خریدتی رہتی تھیں اور اس میں ہماری پسند کو شامل کر لیتی تھیں۔ مس پرینیا کا

شکریہ ہم کس طرح ادا کریں کہ ان کی خوش مذاقی کے باعث ٹوکیو میں ہمارا

وقت بہت خوشگوار گذرا۔ سیمینار کے خاتمہ کے بعد سارے مندوبین تو چلے گئے مگر ہماری اور مس پرینیا کی فلائیٹ کچھ ایسی تھی کہ ہم دونوں کو ایک دن اور ٹوکیو میں رکنا پڑا۔ آخری دن ہم نے ٹوکیو کے ہر بازار کی خاک چھانی۔ مس پرینیا نے اپنے منگیتر کے لئے ڈھیروں سامان خریدا اور حسب معمول ہماری پسند کو معیار بنایا۔

ہم نے کہا "بی بی! آپ نے اپنے منگیتر کے لئے ہماری پسند سے چیزیں تو خرید لی ہیں۔ اگر آپ کے منگیتر کو پسند نہ آئیں تو؟"

بولیں "ایسا ہر گز نہیں ہو سکتا۔ یہ میرا دعوی ہے"

ہم بھلا ان کے دعوے کو جھٹلانے والے کون ہوتے تھے۔

واپسی کے سفر میں بنکاک تک وہ ہمارے ساتھ رہیں۔ ہانگ کانگ میں چار گھنٹوں کا جو وقت ملا تو اس میں بھی مس پرینیا نے شاپنگ کی۔

ہم سے پوچھا "آپ کوئی شاپنگ کیوں نہیں کرتے؟"۔

ہم نے کہا "اس لئے نہیں کرتے کہ ہماری کوئی منگیتر نہیں ہے۔"

اس بات پر حسب عادت زور دار قہقہہ لگایا اور بولیں "مذاق چھوڑیئے۔ سچ! آپ بھی کچھ خریدیئے"

ہم نے کہا "مس پرینیا۔ جی تو ہمارا بھی بہت کچھ خریدنے کو مچلتا ہے۔ لیکن آپ ہمارے کسٹم والوں کو نہیں جانتیں۔ اگر ہماری کوئی منگیتر ہوتی تو تب بھی کچھ

نہ خریدتے"۔

تاہم شاپنگ کے لئے مس پرینیا کے بڑھتے ہوئے اصرار کو دیکھ کر ہم نے ڈن ہل سگریٹ کا ایک کارٹن خریدا تو مس پرینیا بے ساختہ بول اٹھیں "مسٹر حسین! کتنی عجیب بات ہے کہ میرے منگیتر کو بھی ڈن ہل سگریٹ بہت پسند ہیں"

ہم نے فوراً کہا "مگر ہمیں یہ سگریٹ بالکل پسند نہیں ہیں"

"پھر آپ نے یہ سگریٹ کس لئے خریدے ہیں؟" مس پرینیا نے حیرت سے پوچھا

"آپ کے منگیتر کے لئے" ہم نے اعتماد کے ساتھ کہا۔

ہم نے سوچا تھا کہ ہمارے اس جواب پر مس پرینیا ضرور ہنسیں گی۔ مگر وہ خلاف توقع خاموش ہوگئیں۔ ہانگ کانگ سے بنکاک تک وہ سنجیدہ سی بنی بیٹھی رہیں۔ ان کا اصرار تھا کہ ہم بنکاک میں دو چار دن رک جائیں۔ بنکاک کا شہر اور ان کے منگیتر دونوں کو دیکھیں۔ ہم نے کہا زندگی باقی رہی تو پھر کبھی دیکھ لیں گے۔ نہ رہے تو ایک حسرت اپنے ساتھ ہی لے جائیں گے۔ آدمی کو اپنے ساتھ حسرتیں ضرور لیجانا چاہئیے تاکہ دوبارہ پیدا ہونے کا کوئی تو بہانہ باقی رہے۔

بنکاک کا ہوائی اڈہ آیا تو مس پرینیا نے اپنا سامان سنبھالا اور گمبھیر لہجہ

میں بولیں "مسٹر حسین! میں آپ کی شکر گزار ہوں آپ کو اور آپ کی باتوں کو ہمیشہ یاد رکھونگی ۔ میں پر امید زندگی گزارنے کی قائل ہوں ۔ زندگی میں کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی طرح آپ سے ضرور ملاقات ہوگی"

ہم نے کہا" مس پرینیا! ہم بھی پر امید زندگی گزارنے کے قائل ہیں ۔ ایسی زندگی گزارنے کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو بڑے سلیقہ اور اہتمام سے بیوقوف بناتا ہے ۔ اپنی بیوقوفی کو نئے نئے ، اچھے اچھے ، انوکھے نام دیتا ہے ۔ اگر آدمی میں خود اپنے ہاتھوں بیوقوف بننے کی صلاحیت نہ ہوتی تو جینا دو بھر ہو جاتا"

ہم نے سوچا تھا کہ مس پرینیا ہمارے اس تبصرہ پر حسب معمول زور دار قہقہہ لگائیں گی ۔ مگر وہ اپنا سامان اٹھا کر آگے کو نکل گئیں ۔ طیارے کے دروازے پر پہونچ کر انہوں نے پلٹ کر ہمیں دیکھا اور ہاتھ ہلا کر جاپانی میں بولیں "سائیونارا"

پھر ہم نے اپنے سازوسامان میں جاپان کی یادوں کو جتن سے باندھ لیا اور بنکاک سے اڑ کر دہلی آگئے ۔ دہلی کے کسٹم والوں نے خوب جھڑتی لی مگر انہیں پتہ ہی نہ چل سکا کہ ہم اپنے ساتھ جاپان سے کتنی میٹھی میٹھی اور سوندھی سوندھی یادیں لے کر آئے ہیں ۔ انہوں نے صرف ہمارے سامان اور جیبوں کی تلاشی لی ۔ دل کو ٹٹول کر نہیں دیکھا ورنہ پکڑے جاتے ۔۔۔

صاحبو! برادرم نصیر احمد، مالک حسامی بک ڈپو کی کوششوں سے یہ سفر نامہ شائع ہو رہا ہے تو مجھے اس بات کی شخصی خوشی ہے کہ جاپان کی ان سوندھی سوندھی یادوں کی مہک اب کتابی شکل میں محفوظ ہو رہی ہے ۔کوئی بتائے کہ میں ان کا شکریہ کس زبان میں ادا کروں ۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں انہیں بھی جاپانی میں "دوموآری گاتو گزائی مشتا" سے نپٹاتا ہوں ۔

پاکستان کے عالمی شہرت یافتہ مصور اور خطاط صادقین کا سپاس گزار ہوں کہ انہوں نے بڑی محبت کے ساتھ اس کتاب کا سرورق بنایا ۔اس کتاب میں شامل بعض تصاویر کے لئے جاپان کلچرل سنٹر نئی دہلی کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں ۔

میرے مزاح نگار دوست مسیح انجم سخی حسن صدیقی ریسرچ اسکالر ، جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی اور محمود الحسن خان صوفی کی عملی دلچسپی کے باعث یہ کتاب وقت پر منظر عام پر آرہی ہے ۔ایسے رفیقان خاص کا شکریہ کھلے بندوں ادا نہیں کیا جاتا ۔دلوں کا حساب کتاب الگ رکھا جاتا ہے ۔

آخر میں یونیسکو کے ایشیائی ثقافتی مرکز کے سارے عہدیداروں کا احسان مند ہوں کہ ان کے حسن سلوک کے بغیر میری جھولی میں جاپان کی اتنی قیمتی، انمول اور ان گنت یادیں نہ ہوتیں ۔

یہ سفر نامہ ہندی میں نہ صرف چھپ چکا ہے بلکہ مقبول بھی ہو چکا ہے

اور ہندی کی معرفت اس کی بعض قسطیں دیگر ہندوستانی زبانوں میں بھی چھپی ہیں ۔ دیکھنا یہ ہے کہ جس زبان میں یہ سفر نامہ لکھا گیا ہے وہاں اس کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے ۔ سائیونارا ۔

طبع دوم کے موقع پر

جاپان پہلا بیرونی ملک تھا.جہاں مجھے سنہ ۱۹۸۰ کے اواخر میں جانے کا موقعہ ملا -اس کے بعد بیرونی سیاحتوں کا ایک سلسلہ سا شروع ہوگیا - برطانیہ، فرانس، امریکہ ،کناڈا، مرحوم سوویت یونین، سعودی عرب اور پاکستان بھی جانے کا موقع ملا - مگر جو بات جاپان میں دیکھی وہ کہیں دکھائی نہ دی - جاپان سے واپس آکر میں نے اس سفر نامہ کی کچھ قسطیں لکھیں جو قارئین میں بے حد مقبول ہوئیں - سفر نامہ جاپان کا پہلا اردو ایڈیشن ۱۹۸۳ میں شائع ہوا تھا - ہندی کے مشہور رسالہ "ساریکا" نے اس سفر نامہ کو قسط وار شائع کیا تھا جس کے بعد یہ کئی مقامی زبانوں میں بھی چھپا - ہندی میں یہ سفر نامہ ۱۹۸۶ میں کتابی شکل میں شائع ہوا - میرے لئے خوشی کی بات یہ رہی کہ خود جاپانی زبان میں اس کا ترجمہ کتابی شکل میں ۱۹۸۷ میں شائع ہوا اس کا ترجمہ جاپان کی مشہور اردو اسکالر شاشورے نے کیا تھا - جن کا ذکر اس کتاب میں موجود ہے - شاشورے میری بہت اچھی دوست ہیں اور اکثر ہندوستان آتی رہتی ہیں - ادبی حلقوں میں اس سفر نامہ کو جس طرح پسند کیا گیا اس کے لئے میں مختلف زبانوں کے قارئین کا شکر گزار ہوں - اس کتاب کا اردو ایڈیشن عرصہ سے نایاب تھا اب برادرم نصیر احمد مالک حسامی بک ڈپو کی عنایت سے اس کا

دوسرا ایڈیشن شائع ہو رہا ہے۔ برادر عزیز محمد اسلم کا شکریہ واجب ہے کہ
انھوں نے دوسرے ایڈیشن کے پروف دیکھے۔

200 , ANKUR APARTMENTS
PATPAR GANJ
DELHI - 110 092

۳۰/جنوری ۱۹۹۴ء

مُصنّف کی دیگر تصانیف

شیشہ و تیشہ (شاہد صدیقی کے مزاحیہ کالموں کا انتخاب)

تکلّف برطرف (مزاحیہ مضامین کا مجموعہ)

قطع کلام (مزاحیہ مضامین کا مجموعہ)

قصہ مختصر (مزاحیہ مضامین کا مجموعہ)

بہر حال (مزاحیہ مضامین کا مجموعہ)

بالآخر (مزاحیہ مضامین کا مجموعہ)

آدمی نامہ (خاکے)

جاپان چلو جاپان چلو (سفرنامہ)

مجتبیٰ حسین کے کالم (مُرتبہ انیس احمد خاں، زیر طبع)

ناشر

حُسامی بُک ڈپو، مچھلی کمان، حیدرآباد (اے پی)